

# عورت

دیس دیس سے عورتوں کی منتخب کہانیاں



# عورت

دیس دیس سے عورتوں کی منتخب کہانیاں

مشعل بکس

آر بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن،

لاہور۔ 54600، پاکستان

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

[www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)



## فہرست

5	ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا	تعارف
9	(عوامی جمہوریہ چین) جیا پنگاؤ	دو بہنیں
19	(برما) زاؤگی (واتھن ہان)	اس کی بیوی
26	(ملائشیا) شانن احمد	عورت
35	(فلپائن) جویس فلورس (علی بیدانو)	عورت
44	(جاپان) ہیاشی فیومیکیو	ٹوکیو
60	(ملائشیا) ٹائی کانگ	سیلز گرل
71	(کوریا) چوئے چونگ ہی	چوم نائے
81	(کوریا) مسزن کی موت یون سی	مسزن کی موت یون سی
87	(تھائی لینڈ) خامسنگ سری ناک	سیاہ چشمہ
95	(جمہوریہ ویتنام) نگوئن تھی	رخصتی
106	(سنگاپور) میاؤ سیو	واپسی
116	(چین) ژانگ جی	یسے بتائیں جیون ژانگ جی

[www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

[www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

- بوٹی امرتا پر تيم (بھارت) 130  
پيار زاده جنيفر كيولے ڈراسکا (تھائی لينڈ) 138  
ہاتھی دانت کی کنگھی گون سانگ (جمہوریہ ویتنام) 154  
دیوار کے ادھر پر تيم کور (ملائشیا) 171  
ظہور بوسیلہ - دی - ہوسی لوس (فلپائن) 175  
پوئے آہ موئے کیتھرين سم (سنگاپور) 184

## تعارف

ہم اپنے آپ سے ہٹ کر جب بھی کچھ دیکھتے ہیں تو اکثر ہماری آنکھ مغرب پر ہی جا کر نکلتی ہے ادب کے ترجموں کے معاملے میں بھی یہی حال ہے۔ اول تو ترجمے ہی بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں بھی وہ مغربی ادب کے ترجمے ہیں۔ اور ان میں عورتوں کی تحریروں کے تراجم تو شاید خال ہی ملیں۔ یہ کوشش خوب سے خوب تر کی ہوگی۔ لیکن وجہ کوئی بھی ہو ہم اپنے بہت قریب کی تخلیقی فضا سے بڑی حد تک غافل اور بے نیاز رہے ہیں۔ ایشیائی زبانوں کا ادب قدرتی طور پر ہماری زندگی سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ زندگی کے مسائل اور ان کا احساس بھی مشترک ہے اور جن تجربوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ بھی نامانوس نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی ایشیائی ادب سے بہت کم ترجمے کئے گئے۔ اردو کا مترجم اور قاری دونوں اس ادب کی چاشنی سے بے بہرہ رہے، جہاں زندگی کا آہنگ ان کے لئے یکسر اجنبی نہیں۔ ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے لئے ادب سے موثر کوئی وسیلہ نہیں ایشیائی ادب یہ موقعہ فراہم کرتا ہے کہ جغرافیائی قرب کو ایک ذہنی قرب اور تخلیقی عمل کو ایک قدر مشترک بنایا جاسکے۔ ایشیا کے لوگ اس صورت سے ایک دوسرے کے قریب آسکیں گے، اور انہیں اس بات کا بہتر شعور پیدا ہوگا کہ ان کے اپنے علاقے میں لوگوں کے مسائل کیا ہیں ان مسائل سے آگہی کے کیسے کیسے پیکر ہیں اور تجربے نے ان کے احساس کو کس طور پر تراشنے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر ایشیا کی عورتوں کی زندگی کی نچ اپنے ہم

عصروں سے بے حد مماثل ہے۔ اور جب انہوں نے زندگی کو موضوع بنایا ہے تو ان کی کہانیوں کی حیاتی ساخت ہماری اپنی زندگی کی ہی تصویر معلوم ہوتی ہے یہ ترجمے ناواقفیت کے فاصلوں کو کم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی زندگی کا بہتر شعور پیدا کرتے ہیں۔ علاقائی یک جہتی کے لئے ان ترجموں کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ تخلیقی عمل زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور بڑا باریک بین ہوتا ہے۔ زندگی کس صورت سے کرب اور راحت میں تصویریں بناتی ہے، وہ اثر ان ترجموں کے حوالے سے ہی ہم تک پہنچ سکتا ہے۔

کہانی صرف دلچسپی اور چٹخارے کی چیز نہیں۔ بات کو اثر انگیز کرنے کی چیز ہے۔ لطف یہ ہے کہ کہانی اپنی پردہ داری میں زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ یہ زندگی کی سچی اور اصلی تصویر ہوتی ہے۔ کرداروں کے نام فرضی ہوتے ہیں، مگر وہ کردار جو کچھ دیکھتے، سنتے اور محسوس کرتے ہیں وہ خیالی نہیں ہوتا۔ وہ معاشرے میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی پر بیت رہا ہوتا ہے۔ اسی لئے کہانی کے پردے میں زندگی دھڑکتی ہے۔ یہ کہانی جب ایک عورت لکھتی ہے تو اس کی نوعیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ مردوں کی اس دنیا میں تو عورت کی ذات بھی بس ایک کہانی ہے۔ لیکن ایک تو عورت ہی سب سے پہلے کہانی سناتی آئی ہے، اور دوسرے اس کی حساس طبیعت اپنے ماحول اور اپنے مسلوں کا ایک ایسا سچا شعور رکھتی ہے جو کسی صورت صرف ”عورت پن“ کو ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ جو صرف عورت ہونے کا ہی حصہ ہے۔ تیزی سے اس بدلتی ہوئی دنیا میں جہاں معاش، ضرورت اور وسیلوں کے درمیان زندگی مستقل ایک کشاکش میں گھری کھڑی ہے۔ عورت کیا ہے، کہاں ہے، وہ کیا کرنا چاہتی ہے، اسے کیا کرنا پڑتا ہے، وہ اپنے تجربوں کو کس طور پر محسوس کرتی ہے، وہ خود کو زندگی سے کس طرح نبرد آزما دیکھتی ہے، وہ زندگی کی پیکار میں شرکت کا کیا مفہوم جانتی ہے، امن اور جنگ دونوں حالتوں میں معاشروں میں، اور خاص طور پر ان معاشروں میں جو معاشی طور پر ناآسودہ ہیں، اور جہاں زندگی کا کافیننگ رہتا ہے، وہاں عورت کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟ وہ کس کس انداز سے زندگی کو برتی ہے، اور اس کا حوصلہ کس صورت سے رشتہ جاں کو استوار رکھتا ہے۔ وہ محبت سے کیونکر تقویت پاتی ہے، بے عزتی اس کی احساس کو کس طور پامال کرتی ہے اور غم برداشت کر لینے میں اس کی ہمت کتنی ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کس طرح اس کے دل کو سیراب کر دیتی ہیں، اس کے خواب کیا ہیں، وہ اپنے گرد و پیش سے کیا توقع رکھتی ہے، یہ اور اسی جیسے ہزاروں سوال ہیں جو اپنا جواب کہانی کے روپ میں پاتے ہیں۔ زیر

نظر کہانیاں بھی اسی احساس کی آئینہ دار ہیں کہ آج کی دنیا سے کسی طور غافل نہیں ہے۔ کبھی یہ اس کا مقدر کہا گیا ہوگا کہ وہ آئینہ کے مقابل تصویر ہے، آج وہ زندگی کے مقابل ہے اور زندگی کی حرارت کو اس کی رگوں میں شعور اور آگہی بن کر دوڑتی ہے۔

ایشیا قریب کی پندرہ کہانیاں اس ترجمے میں شامل ہیں ان کہانیوں کا پس منظر مختلف ہے۔ خوشحال اور ترقی یافتہ ملکوں کی کہانیاں بھی ہیں اور کم وسیلہ اور ترقی پذیر معاشرہ کی بھی۔ اس لحاظ سے ہمارے ہم عصر ایشیا کی یہ بڑی ہمہ گیر تصویریں ہیں۔ اور وہاں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی بھی۔ اقتصاد کی بے رحم بھاگ دوڑ، اور صرف مادی وسیلوں سے زندگی معیتر کرنے کی کوشش نے عورت کی ذات پر کیا اثر ڈالا ہے، ہم ان کہانیوں میں اس کا گہرا احساس دیکھتے ہیں۔ شہری زندگی کے تقاضوں نے عورت کی ذمہ داریوں کی نوعیت کس طور بدل ڈالی ہے اس کا صرف شعور ہی نہیں بلکہ کرب بھی ان کہانیوں میں موجود ہے۔ ایشیا کی زرعی معاشرت میں عورتوں کی ذمہ داریاں اور تیزی سے اُبھرتی ہوئی صنعتی معاشرت میں ان سے تعلقات کس صورت سے عورت اور مرد دونوں کی زندگیوں کو بدل رہی ہیں، ان کہانیوں میں بڑی حد تک ظاہر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کہانیوں کا موضوع زندگی کے کسی بھی پہلو سے تعلق رکھتا ہو، اپنی جگہ بڑا موزوں اور بھرپور ہے۔ کہانی کی مصنف نے اپنے موضوع اور اپنے احساس دونوں کے ساتھ بے حد انصاف کیا ہے۔ یہ کہانیاں اپنے ملکوں کی سفیر ہیں، اور ایسی سفیر جو مصلحتوں کی پابند نہیں، بلکہ حقیقتوں کی ترجمان ہیں۔

ان کہانیوں میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشوں کی جنگ کے ہاتھوں شنی کی کہانی بھی ہے۔ اور یہ بھی کہ عورت کا وجود جان دار ہو کر بھی بے جان، بے وقعت اور بے آواز موجود ہے۔ غربت، کمپرسی اور بھوک کی تکلیف کا احساس ہے تو دوسری طرف آسائشوں کی خاطر کوکھ کرایہ پر دینے کی تصویر بھی۔ انا اور عزت کا شدید تصور بھی ہے تو دوسری طرف انسان شناسی میں غلطی اور خطا کا غم بھی۔ ایک طرف ذات کا کرب تو دوسری طرف شرافت ذہنی کا احساس، عورت ہونے کا کرب اور ممتا کی مجبوری و محرومی کہیں کہانی بنتی ہے تو کہیں مجبوریوں کی چوٹ اور مجبوری کا درد احساس ذات بن کر اُبھرتا ہے۔ اس حوصلہ کی عکاسی بھی ہے جب زندگی کے بھید سمجھ میں آنے لگتے ہیں اور سطحی جذباتی لگاؤ سے اُٹھ کر ایک ارفع حیاتی سطح تک بلند ہونے کی فکر رہتی ہے تاکہ محبت میں خُسن اخلاق کی برتری ہے۔ اور ایک طرف عورت اور مرد کی ایک دوسرے کے



لئے قدرتی کشش کی بھولی تصویر ہے تو دوسری طرف ایسی دانش بھی جہاں محبت کی یافت سے مطمئن ہونے اور مرنے کے بعد بھی جذبوں کو مستحکم رکھنے کی قوت ہو۔ زندگی کو قبول کر لینے اور اس سے حظ اٹھانے کا جذبہ بھی۔ شکایت کی بجائے شکر کر لینے کی صلاحیت، محرومیوں کا شکوہ کرنے کی بجائے جو خوشی بھی مل جائے اسے سراہنا یہ سمجھ لینے کا ظرف کہانی کے پردے میں ہم سے زندگی کی کہانی کہتا ہے۔ یہ کہانیاں جاپان، کوریا، ویت نام، ملائیشیا، برما، چین، فلپائن اور تھائی لینڈ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم ان علاقوں کے لوگوں سے نسبتاً کم واقف ہیں۔ یہ کہانیاں ہمیں ان لوگوں کے قریب لے جاتی ہیں جن کی زندگی اور اس کی صورتیں بڑی حد تک ہماری طرح کی ہیں۔ بھارت کی قد آور مصنفہ امرتا پریتم بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ گو اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جنوبی ایشیا کی کہانیاں اور خاص طور پر عورتوں کی لکھی کہانیوں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا جائے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ترجمہ بے ساختہ اور رواں ہے۔ کہیں کہیں جو ذرا سی ناہمواری لگتی ہے، وہ زبان سے زیاں خیال کو منتقل کرنے کی مشکل ہے۔ اس سے خوبی یہ باقی رہی کہ ترجمے نے اصل کا مزہ نہیں کھوایا اور خیال کی فکری رو کو قائم رہنے دیا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ہاں یہ ترجمے سنجیدگی سے پڑھے جائیں گے، صرف نئی کہانیوں کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کہ ہمارے بہت پاس رہنے والے کس صورت سے زندگی کو برت رہے ہیں۔ اور انہیں اپنے اس برتاؤ کو تخلیقی عمل میں ڈھالنے کا کیا سلیقہ آتا ہے۔ مشعل کا ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے کہ انہوں نے تخلیقی قوتوں کے انجانے گوشوں کو تلاش کیا اور ہمیں روشنی دی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

[www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

چاپنگاؤ  
(عوامی جمہوریہ چین)

## دو بہنیں

پچھلے موسم گرما میں گاؤں میں بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد میں اپنی خالہ جان سے ملی اور یہ جون کے مہینے میں ہوا۔ اسی ماہ کی چھ تاریخ کو دہقان روایتی طور پر اپنے ملبوسات اور بستری کی چادریں وغیرہ دھوپ میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ کیڑوں سے محفوظ رہیں۔ سفیدے کے درختوں کے درمیان بندھی رسی سے رنگا رنگ فرکوٹ، ریشمی رضائیاں، کھال کی چادریں اور اونی جرابیں لٹک رہی تھیں۔ میں اُن کی طرف دیکھ رہی تھی کہ میرے کانوں میں کسی کی ہنسی کی آواز آئی۔ ایک درخت کی اوٹ میں ایک نوجوان لڑکی کچھ گیلے کپڑوں کو ایک بوڑھی عورت کے ساتھ تہہ کر رہی تھی۔ وہ لڑکی اتنے زور سے کھینچتی تھی کہ ہر بار اُس کی ماں کو ایک دھکسا لگتا تھا۔

’’دیکھو۔۔۔۔۔ احتیاط کرو۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو، کپڑے کو اس طرح تو نہ کھینچو۔۔۔۔۔‘‘ ماں نے ایت آمیز لہجے میں کہا۔ لڑکی ہنستی رہی اور بدستور زور سے کھینچتی رہی۔

’’تم بہت شرارتی ہو۔‘‘ اُس کی ماں نے سرزنش کی اور پھر ایک دم کپڑے کو اتنے زور سے کھینچا کہ لڑکی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا سر چھوڑ دیا۔ اُس کی ماں پیچھے کو گرنے لگی۔ لڑکی بھاگ کر آگے ہوئی اور اپنی ماں کو تھام کر ہنسنے لگی اور اس مرتبہ ماں بھی ہنسی میں شامل ہو گئی۔ یک

دم ماں نے اُسے چپ ہونے کے لئے کہا اور پھر ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا لڑکی خاموشی سے بچوں کے بل چلتی ہوئی اُس کی طرف گئی لیکن غلط سے کھڑکی کی چوکھٹ کے ساتھ زور سے جا لگی وہ بھاگتی ہوئی واپس آئی اور چیخ کر کہنے لگی: ”تم باہر دُھوپ میں کیوں نہیں آتیں؟ کیا تم مزہما جاؤ گی!“

اسی لمحے میری خالہ نے مجھے دروازے کے سایے تلے کھڑے دیکھا اور میرے لیے چائے لے کر آگئی۔ چنانچہ میں نے لڑکی کو بھی دعوت دی۔ اس نے دعوت قبول کر لی لیکن اُس کی ماں ناراض ہونے لگی۔

”لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے؟ یہی ناکہ اب میں اسے ”بہن“ کہہ کر بلا لوں گی۔“ اُس نے سینہ تان کر کہا۔

”میری بھانجی ایک زرعی کالج میں بہت اچھی طالبہ ہے، میری خالہ نے کہا، ”اور تم اسے اُستانی کہو تو بہتر ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی اُس وقت کیا دیکھ رہی تھی۔

”میں اپنی ماں کے پالتو جانور کو دیکھ رہی ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔

میری خالہ نے بتایا کہ لڑکی کا نام کریسنٹ ہے اور کمرے کے اندر اُس کی بہن ہے جس کا نام مون ہے اور وہ بریگیڈ کے تحقیق گروپ کی ممبر ہے۔ وہ ایک تجربے میں مصروف تھی اس لیے کسی کو نخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

”وہ خاندان بھر کی لاڈلی ہے اس لیے ہمیں اُس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“ کریسنٹ نے لب سکیڑ کر کہا۔

”اور تم؟“ میں نے اُسے چھیڑا۔ ”میں؟ مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو

مجھے یہ خیال آتا ہے کہ کیا واقعی میری بھی کوئی ماں ہے؟“

ہم سب کھکھلا کر ہنس پڑے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہنس رہی تھی اور سب سے بلند آواز

میں۔ اُس نے میرا تھیلا دیکھ کر اُس میں سے دو کتابیں نکال لیں۔ ”یہ کیا ہیں؟“

”انگریزی کتابیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تم انہیں سمجھ سکتی ہو؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ میری خالہ بول پڑیں۔ ”یہ تو پہروں انہیں پڑھتی رہتی ہے

اور پھر بھی تھکتی نہیں۔‘

اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی بہن کے پاس بھی انگریزی کی کچھ کتابیں ہیں اگرچہ وہ اتنی بڑی بڑی نہیں ہیں۔ اُسے اپنی بہن کو پڑھتے ہوئے سننے کا بڑا شوق تھا لیکن اُسے اُس کے ہمراہ مطالعہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف اُس کی خوشی کی خاطر میں نے اپنی کتاب اُسے سنانی شروع کر دی۔ ابھی صرف آدھا صفحہ ہی ختم ہوا ہو گا وہ میدان کی طرف بھاگی کیونکہ وہاں ایک لڑکا پتھر کے رولر کے ساتھ سرکنڈوں کو کچل رہا تھا۔ وہ رولر کے اوپر چڑھ کر ہنسنے لگی۔

شام کو بڑی بوٹیوں کی ایک چینی دوائی کو گرم کرتے اور پڑھتے ہوئے میں نے دروازے کے ساتھ ایک آواز سنی۔ میں نے سوچا شاید تیز ہوا ہے اس لیے پروانہ کی۔ دستک دوبارہ ہوئی۔

’کیا تم نے ابھی سونے کی تیاری نہیں کی، اُستانی لُو؟‘ ایک آواز نے پوچھا۔  
’کون ہے؟‘ میں نے پوچھا۔ دروازہ کھولا تو وہاں ایک شرمیلی لڑکی چوکھٹ کے ساتھ ٹیک لگائے اپنی چوٹیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

’میں مُن ہوں اور تمہارے سامنے والے کمرے میں رہتی ہوں۔ میں اتنی دیر سے تمہیں تکلیف دینے کی معافی چاہتی ہوں۔‘

میں ایک نئی دوست کو پا کر بے حد خوش ہوئی تھی چنانچہ میں نے اُسے خوش آمدید کہتے ہوئے بستر پر بیٹھنے کو کہا۔ ’تم اپنی بہن سے بالکل مختلف ہو۔‘ میں نے اُسے بتایا اور نطا ہرے میں کریمینٹ کا حوالہ دے رہی تھی۔

’ہم سب مختلف ہیں۔‘ وہ مسکرائی۔ ’اُس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا ہے اور کہا ہے کہ تم اپنے ہمراہ کچھ انگریزی کتابیں لائی ہو۔ تم یہاں کتنا عرصہ قیام کرو گی؟‘  
’تقریباً دس روز۔‘

اس سے زیادہ کیوں نہیں؟‘ اُس نے ہوا میں دوائی کی بوسٹکھی تو کہنے لگی، ’کیا تم پیار ہو!‘

میں نے اُسے بتایا کہ معدے میں خرابی کے بعد میں یہاں اپنی صحت کی بحالی کی خاطر آئی ہوں۔

اُس نے منہ بنایا اور کہنے لگی: ’میں کل اپنے ہم جماعت سٹنگ ون کو خط لکھوں گی، وہ



میرا کمرہ تہہوں سے بھر جاتا۔ جلد ہی میں اُس کے ساتھیوں کے ساتھ بھی بے تکلف ہو گئی۔ لی سان ہو ایک ایسا نڈرا اور چابنا تھا جو بلند ترین درختوں پر چڑھنا پسند کرتا تھا اور دریاؤں میں پھلانگ لگا کر دیر تک پانی کے نیچے رہ سکتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ ٹیم کے لیے شہتیرا اٹھا کر لے جاتا یا دریا میں کچھ نکالتا۔ وہ مشکل کام کرنا پسند کرتا تھا۔ دوسرا لڑکا ذبا نگ یوگ لڑکیوں سے بہت شرماتا تھا اس لیے اُسے ’جاگیردار‘ کا لقب دیا گیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اور کرینٹ رسوں کی مدد سے ایک بھاری پتھر لے جا رہے تھے۔ اُس نے چوری چھپے سے کو اپنے نزدیک کر لیا چنانچہ کرینٹ نے اعتراض کیا کہ وہ عورتوں کو کمتر درجے کی مخلوق سمجھتا ہے۔ اُسے اتنا ڈکھ ہوا کہ وہ رونے لگا۔ پھر ایک لڑکی تھی جس کا نام بان فاگر تھا اور اُس کی زبان بڑی چلتی تھی۔ صرف کرینٹ اسی سے ڈرتی تھی کیوں کہ اُس نے اسے ایک مرتبہ سب کے سامنے گولا لڑاتی مُرغی کہہ دیا تھا۔ کرینٹ کا یہ نام پوری ٹیم میں بہت پسند کیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد کرینٹ کے تہہوں اور لطفیوں کی وجہ سے اُن اپنے کمرے میں ہی بند رہنے لگی۔

’تم پاگل ہو گئی ہو کرینٹ‘ اُس کی ماں نے ساتھ والے کمرے سے اُسے سرزنش کرتے ہوئے کہا ’تم ہمیشہ قہقہے لگاتی رہتی ہو اور ہر وقت کبھی کبھی کرتی رہتی ہو۔ جب میں تمہاری عُمر کی تھی۔‘ اُس کی ماں نے بات جاری رکھی، ’میں سارا دن کام کاج میں مشغول رہتی تھی اور میں نے کبھی۔۔۔۔۔‘

’تم جب میری عمر کی تھیں تو تمہارے پاس قہقہے لگانے کا کوئی جواز ہی نہ تھا لیکن میں ہنس سکتی ہوں اور میں خوش ہوں تو تم حسد کیوں محسوس کرتی ہو!‘

’صرف اس لیے کہ میں نوجوان ہوں مجھے ہنسنا نہیں چاہیے؟‘

اُس کی ماں جواب دینے سے قبل کھانسی۔ ’میرا مطلب ہے تمہیں اپنی بہن کی طرح ہونا چاہیے۔‘

’نہیں، کبھی نہیں۔ اُس کو انگریزی سیکھنے کی ضرورت ہے لیکن مجھے نہیں۔ بہر حال میں

سچیدہ نہیں رہ سکتی۔ تم نے مجھے بندر یا نہیں کہا تھا؟‘

’کم از کم تم اپنی بہن کی کچھ مدد تو کر سکتی ہو۔‘ میں نے مشورہ دیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد کرینٹ کہنے لگی: ’تم درست کہتی ہو لیکن میں کیسے اُس کی

مدد کروں؟‘

میں اُسے کچھ مشورہ دینے والی تھی لیکن جب میں پانی کا ایک گلاس لے کر باورچی خانے سے واپس آئی تو میں نے اسے بستر پر گہری نیند میں سوتے پایا چنانچہ میں مَن کے پاس چلی گئی۔ اُس کے چھوٹے سے کمرے میں مرتبان، پیٹیاں اور مختلف اجناس کے بیجوں کی بوریاں بھری پڑی تھیں۔ اُس کی دیواروں پر پہاڑے، گراف، نقشے اور موسمی چارٹ لٹک رہے تھے۔ اُس کا سردیوار کے ایک کونے میں دھنسا ہوا تھا اور وہ گندم کے بیج کو عدسے کی مدد سے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے عین اُوپر ایک بلبل گندم کے ایک کھیت کے اُوپر پرواز کرتا دکھایا گیا تھا جو بہت اچھی فصل کی علامت تھا۔ ”کیا تم نے کوئی نئی قسم دریافت کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ذرا اُس کو دیکھو“ وہ ایک اضطرابی کیفیت میں کہنے لگی۔ ”اور تم اس کا کوئی نام رکھ دو“۔

اُس کی ہتھیلی میں گندم کا ایک بیج تھا۔ سبزی مائل اور عام قسم سے لمبائی میں کم از کم دگنا۔ یہ ایک مصنوعی قسم تھی۔ اس نے تین برس کے تجربوں کے بعد یہ قسم پیدا کی تھی۔ اس کی کامیابی پر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ دانے کے وزن سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عام گندم کی نسبت زیادہ آٹا دے سکتا تھا۔ میں اس سوچ میں تھی کہ آخر اُس نے اپنی تمام تر توانیاں صرف تحقیق کے لئے ہی کیوں وقف کر رکھی ہیں۔

”ہم اسے ’کامیاب گندم‘ کا نام کیوں نہ دے دیں؟“ میں نے تجویز پیش کی

”نہیں، وہ مسکرائی۔“ کامیابی ابھی بہت دور ہے اور اس بیج میں ابھی کچھ خرابیاں ہیں۔ میں اسے مزید بہتر بنانا چاہتی ہوں۔ کیوں نہ ہم اسے بہتر گندم، کا نام دے دیں؟“ میں نے اتفاق کیا۔ میں جاننا چاہتی تھی وہ اس کے بعد کیا کرے گی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا گروپ اس بیج سے ایک نیا بیج بنانے کا خواہش مند ہے۔ اگر وہ مکمل طور پر کامیاب ہو گئے تو پھر اس کا نام ’کامیاب گندم‘ رکھ دیا جائے گا۔ پچھلے چند دنوں کے دوران اُسے مختلف جگہوں سے زیادہ فصل دینے والی اقسام کے بیج وصول ہوئے تھے اور اُس نے انہیں مختلف کھیتوں میں بونے کا ارادہ کیا ہوا تھا تاکہ اُن کا موازنہ کیا جاسکے۔ وہ پہاڑ کے پار والے ایک بریگیڈ سے بھی کچھ بیج منگوانا چاہتے تھے لیکن اُن کے پاس کوئی ایسا فالتو شخص نہ تھا جو وہاں جاسکے۔

”تم کریسنٹ کو اس معاملے میں مدد کرنے کو کیوں نہیں کہتیں؟“ میں نے مشورہ دیا۔

”نہیں، وہ بے حد غیر ذمہ دار ہے۔“

”میں اُس کے ہمراہ جا سکتی ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ اپنی فصل اب کیوں کاشت کر رہے ہیں جب کہ تم کاشت ختم بھی کر چکی ہو۔  
چنانچہ اگلی صبح کرینٹ اور میں نے دریا عبور کیا اور دیکھا کہ پہاڑ کے پیچھے وہتان ابھی فصل کاشت کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کاشت میں اتنا فرق کیوں ہے؟“ میں قہقہے لگانا کیوں پسند کرتی ہوں؟“ اس نے جواب دیا۔  
میں اُس بے سکتے جواب سے بوکھلا گئی۔

”تمہیں اس بارے میں میری بہن سے پوچھنا چاہیے۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”میں تو تمہیں بند باندھنے، کھیتوں میں ہل چلانے، پتھر توڑنے اور پہاڑوں کو بارود سے اڑانے کے بارے میں بتا سکتی ہوں۔“

برگیڈ کے لیڈروں کی اجازت سے ہم گندم کے کھیتوں میں بیج چھننے کے لیے چلی گئیں۔ ہم نے پانچ لمبے قد کے پودے چنے جن کی بالیاں لمبی اور بیجوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جب ہم گھر پہنچیں تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ کرینٹ گندم کی بالیوں کو مسلتے ہوئے کہنے لگی کہ اب میری بہن مجھے ایک ایسی بیوقوف لڑکی نہیں کہے گی جو سارا دن صرف قہقہے لگاتی رہتی ہے۔

”کیا وہ تم سے پیار کرتی ہے؟“ میں نے یک دم پوچھا  
”کبھی کبھار۔“ اُس نے جواب دیا ”لیکن میرا خیال ہے کہ اُسے سائنس سے زیادہ پیار ہے۔“

”کیوں؟“

”اپنے نظریات کی وجہ سے۔“

”کیا مطلب؟“

’ڈاڑھائی، زراعت میں ایک مثالی ترقی یافتہ برگیڈ سمجھا جاتا ہے اور ہمارا برگیڈ اس سے سیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور اُمید ہے کہ اگلے دو برسوں میں وہ بھی ڈاڑھائی برگیڈ کی طرح ترقی کر جائے گا۔“

کیا شاندار منصوبہ ہے۔ میں نے نیلے آسمان کی جانب دیکھا اور پھر سڑک کے دونوں طرف چل پڑے گندم کے گٹھوں کو، جن میں سے گندم نکالی جاتی تھی، اور برگیڈ کے اراکین ترازو پر اُن کا وزن کر رہے تھے اور اُن میں سے ایک بلند آواز میں وزن بتاتا جاتا تھا۔ جونہی





یہ احساس کرتے ہوئے کہ یہ کام کتنا اہم تھا وہ میرے ساتھ آگئی اور بڑے راز دارانہ لہجے میں بولی ”میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب قہقہے نہیں لگایا کروں گی۔۔۔۔۔ تم دیکھ لینا، ایسا ہی ہوگا“

”بیوقوف مت بنو“ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی ”انسان قہقہے کیوں نہ لگائے؟ تمہاری بہن یہ تو نہیں چاہتی کہ تم سارا دن منہ پھیلائے بیٹھی رہو، وہ تو صرف یہ خواہش کرتی ہے کہ تم میں احساس ذمہ داری زیادہ ہو۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں اسے سمجھ نہیں سکی تھی۔“

اس کو سمجھتے ہوئے میں نے اس کی معصومیت اور سنہرے دل کو محسوس کیا۔

”کیا میں احمق ہوں؟“

”بالکل نہیں“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ میں پہروں کسی بات پر سنجیدگی سے غور کر سکتی ہوں جس طرح کہ

میری بہن کر سکتی ہے؟“

”ظاہر ہے“

”کیا تم مجھے سروے کرنا سیکھاؤ گی؟ ہماری بریگیڈ اپنے کھیتوں کو بہتر بنانا چاہتی ہے

اور وہ مدد کرنے کے لئے کہتے ہیں لیکن میں کچھ خوفزدہ ہوں۔۔۔۔۔“

مجھے کھیتوں کی لمبائی چوڑائی اور سروے کرنے کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہ تھا لیکن

میں نے وعدہ کیا کہ میں اس موضوع پر اسے چند کتنا میں خرید دوں گی، جب بھی میں قہصے کی جانب

گئی۔۔۔۔۔ وہ ابھی تک رورہی تھی لیکن اس نے اب کچھ بہتر محسوس کیا۔ پھر مجھے قدموں

کی آواز سنائی دی۔ کریسنٹ نے بتایا کہ یہ مومن ہے اور جلد ہی ہم اسے انگریزی الفاظ دہراتے

ہوئے سن لیا۔

مومن نے بتایا کہ بریگیڈ کے دفتر نے اسے صوبائی صدر مقام میں منعقد ہونے والی

سائنس اور ٹیکنالوجی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے کہا تھا اور وہ اگلی صبح وہاں جا رہی ہے۔

طلوع آفتاب کے بعد ہم مومن کو بسوں کے اڈے پر چھوڑ آئے۔۔۔۔۔ اس کے

بعد ہر روز کریسنٹ صبح سویرے اٹھ جاتی۔ میں اسے اکثر اپنی کھڑکی میں دیکھتی۔ وہ انگوری کی

ایک بیل کے نیچے کھڑی کنویں کے قریب حساب کا کوئی فارمولہ یاد کر رہی ہوتی۔ دوسرے لوگ

جب بیدار ہوتے تو وہ صحن کی صفائی میں مشغول دکھائی دیتی۔ کام کاج ختم کرنے کے بعد شام کو میرے پاس آ جاتی اور اپنی مشکلیں بیان کر کے ان کے حل دریافت کرتی۔۔۔۔۔ وہ مون سے زیادہ ہوشیار تھی۔ جب کبھی وہ کوئی حل تلاش کرتی تو پھر اس کی تفصیل میں جاتی کہ یہ کیسے ممکن ہے وہ ہمیشہ مطمئن اور خوش واپس جاتی۔

جس روز مجھے اپنے کالج واپس جانا تھا میری خالدہ جان اور کریسنٹ کی ماں میرے ہمراہ گاؤں کے باہر تک گئیں۔ کریسنٹ پتہ نہیں کہاں تھی اور اس کی ماں بتا رہی تھی کہ دراصل وہ کام پر چلی گئی ہے اور اسے لانے کے لئے کسی کو روانہ کیا گیا ہے۔ سٹیشن کی طرف روانگی سے میں اُداس ہو رہی تھی۔ جونہی میں وہاں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ کریسنٹ پسینے میں بھیگی میری جانب بھاگی چلی آ رہی ہے۔

”کاش تم ہمیشہ کے لئے یہاں رہ جاتیں“ وہ تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہہ رہی تھی  
 ”اور مجھے محنت سے پڑھنے کا حوصلہ دیتیں اور زیادہ ترقی کرنے کے لئے میری ہمت بندھا تیں“۔

”جونہی مجھے چھٹیاں ہوئیں میں واپس آ جاؤں گی اور جونہی میں اپنے قصبے میں پہنچوں گی میں وہ نصابی کتابیں تمہیں بھیج دوں گی“۔

یکدم مجھے یاد آیا۔ میں نے اپنے تھیلے میں سے انگریزی کی نصابی کتابیں نکالیں اور کریسنٹ سے کہا کہ وہ انہیں مون کے حوالے کر دے۔

”بہت بہت شکریہ۔۔۔۔۔ اگلے برس ہم تمہیں اپنی ”کامیاب گندم“ دکھائیں گے“۔

جب میں قصبے میں تھی تو ایک روز ایک ٹرام میں اتفاقاً مون سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ایک انگریزی چینی کتاب پکڑے ہوئے تھی اور اس نے مجھے بتایا کہ اس نے کانفرنس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان کے تجربے کی روشنی میں وہ اپنی تحقیق کے کام کو تیز تر کر دے گی۔  
 ”کیا خیال ہے تم کب تک کامیاب ہو جاؤ گی؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر ایک برس میں نہیں تو زیادہ سے زیادہ دو برس میں“ اور پھر انگریزی زبان میں کہنے لگی ”راستے کی مشکلات کے باوجود میں یقینی طور پر کامیاب ہو جاؤں گی“۔

زاوگی (داتھن بان)

برما

## اُس کی بیوی

(۱)

ماپا، کوہسن کی بیوی، منڈی میں کام کرتی تھی۔ ہر صبح ٹرے پر سبزیاں سجائے وہ ایک میل پیدل چل کر شہر پہنچتی۔ اگر کاروبار تیز ہوتا تو وہ دوپہر تک واپس آ جاتی ورنہ شام تک وہیں رہتی۔ جب بھی وہ واپسی پر بانس سے بے ہوئے اُس پل کے قریب پہنچتی جو گاؤں کے قریب ندی پر واقع تھا تو اُس کو اپنے خاوند اور بچوں کا خیال آنے لگتا۔ وہ دراز قد تھی اور اُس کے بال سُرخی مائل تھے۔ اُس کے دانت تھوڑے سے باہر کونکھے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ بد صورت ہے۔ اُس کا خاوند کوہسن ایک آرام طلب شخص تھا جو گھر میں بیٹھا کھاتا پیتا رہتا۔ یہ تو درست نہیں کہ وہ بالکل بڈھرا تھا کیونکہ وہ چاول پکاتا اور بچوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

کوہسن مہا تہا بندھ کے راہبانہ سلسلے میں ایک نوآموز کی حیثیت سے نو برس گزار چکا

تھا، چنانچہ وہ کچھ بڑھا لکھا بھی تھا۔ وہ طبیعت کا بہت اچھا اور ہنسنے ہنسانے کا شوقین تھا اسی لیے شادیوں اور خیراتی محفلوں میں آگے آگے ہوتا۔ وہ اپنی بیوی جتنا دراز قدر نہیں تھا۔ اُس کی چھاتی چھوٹی، بال گھنے اور ہونٹوں پر ایک پتلی مُو چھتھی۔

جب اُن کی شادی ہوئی اور پھر ایک بیٹا پیدا ہوا، ماپا نے دکان کا خیال رکھنا شروع کر دیا اور علاوہ ازیں کوہسن کی ضروریات کو بھی پورا کرنے لگی۔ جب دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو پھر اُس کے پاس صرف دکان کے لیے وقت رہ گیا اور بیٹی کی پیدائش کے بعد تو ماپا بہت ہی تھک جاتی۔ ایک مرتبہ جب اُسے کاروبار میں خاصا گھانا برداشت کرنا پڑا تو اُس پر ترس آتا تھا لیکن اُس کے لبوں پر شکایت کا ایک لفظ نہ آیا

جب کبھی اُس کی کوئی سہیلی کہتی: ”تم ذرا اپنے خاوند کو مہا تمباہہ کی توصیف کرتے اور اُس کی برکتوں کا بیان کرتے ہوئے گاؤں کی ایک شادی میں سنتیں: بہت ہی شاندار۔۔۔۔۔۔ وہ بہت ہی عالم فاضل شخص ہے۔“ تو اُس وقت وہ بے حد فخر محسوس کرتی۔ جب اُس کا چودہ سالہ بیٹا بانس کے پل پر آکر اُس سے بھاری ٹوکری اور ٹرے لے کر خود اٹھالیتا تو اسے بے حد خوشی ہوتی۔ ان لمحات میں وہ اپنے خاوند کے لیے جذبہ تشکر سے لبریز ہو جاتی۔ ایک مرتبہ جب وہ اور اُس کے بچے گھر کی چھت پر تھے تو شراب کے نشے میں دھت ایک شخص نے سڑک پر کھڑے ہو کر واہیات قسم کے اشارے کیے بچے خوفزدہ ہو کر گھر کے اندر بھاگ گئے۔ کوہسن جلدی سے باہر آیا اور آستینیں چڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ شرابی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور پھر وہ ڈگمگاتا ہوا چلا گیا۔ ماپا بے حد شکر گزار ہوئی۔ اُس نے سوچا اگر میرا خاوند نہ ہوتا تو ہماری کتنی بے عزتی ہوتی! ماپا اب اپنے سینتیسویں برس میں تھی۔ کوہسن اُس سے چھ برس بڑا تھا۔ کوہسن اگرچہ اتنا بڑا ہو گیا تھا لیکن آج تک اُس نے سچ بچ کوئی کام کر کے نہیں دیا تھا۔ جب لوگ کہتے کہ وہ اپنا توازن بیوی کے لباس کا کونہ تھا مگر قائم رکھتا ہے تو وہ مذاق سے کہتا: ”میں اپنے شاندار کارناموں کی وجہ سے اب آرام کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوا ہوں: تم حسد نہ کرو۔“ اگرچہ انھیں وہ یہی کہتا لیکن دل ہی دل میں اُسے دکھ ہوتا۔ لیکن جلد ہی وہ اس دکھ کو بھول جاتا اور اُس کا جواب سن کر دوسرے لوگ منہ بنا کر بدتمیزی سے اپنی ٹھوڑی آگے کر دیتے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے ہمسایوں کی ایسی باتیں سن کر ذرا گرمی کھا گیا۔ اُس نے ایک چچا زاد سے کچھ رقم ادھار لی اور بانس کے کاروبار میں شریک ہو گیا۔ لیکن اسے بہت گھانا پڑا اگلی بارشوں میں وہ ہل چلانے

کے لیے کھیتوں میں گیا۔ وہ گھر واپس آیا تو اُس کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس پر ہل کا پھالا لگ گیا تھا۔ زخم کے بھرنے میں پورے پندرہ دن لگے۔

(۲)

جس روز وہ ٹھیک ہوا وہ تینتالیس برس کا ہو چکا تھا۔ بدن کا زخم تو بھر گیا لیکن دل کا زخم ابھی ہر اتھا۔

ماپا صاحب معمول منڈی جا چکی تھی۔ سب سے بڑا بیٹا راہبوں کے سکول جا چکا تھا۔ باقی دونوں بچے گھر کے سامنے اہلی کے درخت تلے کھیل رہے تھے۔ کوہسن سبز چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ اُس نے چھ بچوں کے باپ کو ایک بڑھئی کو اوزاروں والے بکس کے ساتھ برابر کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ اُس کا ایک ہمسایہ ندی پار دانی کے پتے کاٹنے گیا۔ یہاں تک کہ سامنے کے گھر میں رہنے والے بوڑھے نے بھی لکڑی کے ایک ٹکڑے کو چاقو سے کاٹا اور کچھڑ میں چلنے کے لیے چھڑی بنانے لگا۔

پہلے پہل تو کوہسن آرام اور سکھ چین سے چائے کے ایک پیالے کے بعد دوسرا پیالہ پیے چلا جا رہا تھا اور بچوں کو کھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا لیکن جب اُس کے ہمسائے کام کاج کے لیے حرکت میں آئے تو اُس کا یہ سکھ چین ڈھنلا گیا اور اُسے یاد آ گیا کہ ابھی تو اُس نے چاولوں والا برتن چولہے پر رکھنا ہے۔ یک لخت اُسے ہمسایوں کے طعنے یاد آنے لگے اور اپنی ساری زندگی اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی: راہب خانہ چھوڑنے کے بعد اُس کی سستی، ماپا کے ساتھ اُس کی شادی، اُس کا روبرو باری ناکامی، اُس کا زخمی پاؤں۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ تھا اور اداسی اُس کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ اس قسم کی زندگی سے چھٹکارا پا جائے۔ اُس نے سوچا کہ راہب بن جانا چاہیے۔ یوں اُسے چاول نہیں اُبالنے پڑیں گے۔ وہ اپنی آنکھیں اچھائی کی معراج کی جانب موڑ دے گا۔ اُس کی بیوی اور بچے اُس کی وجہ سے عزت پائیں گے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ دوبارہ پیدائش دکھوں سے آزادی کا لمحہ قریب آ گیا ہے۔ وہ خود ایک چھوٹا سا دیوتا بن جائے گا۔۔۔۔۔ اور یوں وہ سوچتا رہا لیکن اُسے پھر یاد آ گیا کہ اُسے چاول بنانے ہیں ورنہ کھانے کو کچھ نہ ہوگا اور بچے شور مچائیں گے۔ وہ اُٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔

اس دوران منڈی میں ماپا اپنی سبزیوں پر پانی چھڑک رہی تھی تاکہ اُن کا وزن زیادہ ہو جائے اور اُس کی آمدنی بڑھ جائے۔ اس زاید آمدنی سے وہ اپنے خاوند کے لیے رگ رخریدنا چاہتی تھی۔

کوہسن چاول اُبالنے میں بہت ماہر تھا۔ اُس نے بچوں کو بلا کر اُنھیں کل کے بچے ہوئے سالن کے ساتھ چاول دیے۔ جب بچے واپس جا کر کھیلنے لگے تو وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا اور پھر سے خیالوں میں گم ہو گیا۔

جب وہ رات کو جاگے گا تو صبح وہ اپنے کشتیوں کے ساتھ بھیک مانگنے کے لیے ماپا کے گھر آیا کرے گا اور بیٹوں ماپا اور بچوں سے مل لیا کرے گا۔ لیکن ماپا بالکل ان پڑھ تھی اور مذہبی قانون کے بارے میں لاعلم تھی۔ جب وہ مرے گی تو نچلے طبقوں میں چلی جائے گی۔ ا سے اپنی بیوی پر ترس آتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اُسے مذہبی قانون کے بارے میں کچھ علم ہو جائے۔ بچوں کے بھگڑے کے شور نے اُسے حقیقت کی دنیا میں لاکھڑا کیا۔ بہن نے اپنے بھائی کو ناخن مارے تھے اور اُس نے بدلہ لینے کے لیے اُس کے بال نوچے تھے اور اب دونوں رو رہے تھے۔

کوہسن نے بچوں کو گھر کے اندر بلایا اور اُنھیں کمرے کے مختلف کونوں میں بٹھا دیا۔ اب اُس نے اپنے خواب میں واپس جانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اُس نے بچوں کی طرف دیکھا ان کے سر نیند کے بوجھ سے جھوم رہے تھے۔ اُس کے اندر بھی ایک ہمائی نے انگڑائی لی۔ ”یہاں سے ہلنا نہیں۔“ اُس نے بچوں کو حکم دیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ جونہی اُس کی آنکھیں بند ہوئیں بچوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُنھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور پھر اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ جونہی وہ سو جائے گا ہم باہر جا کر کھیلنے لگیں گے۔

کوہسن کی آنکھ کھلی تو ماپا املی کے درخت تلے اپنے بیٹے کو بلارہی تھی: ”فور اُنچے اُتر آؤ ورنہ گر جاؤ گے۔ تمہاری بہن کہاں ہے؟“

”کوہسن۔“ ماپا نے چیخ کر کہا۔ ”کیا تم اپنے بچوں کی رکھوالی بھی نہیں کر سکتے۔ تم کس قسم کے باپ ہو؟“ لڑکا درخت سے نیچے اُتر آیا اور جب بیٹی واپس آئی تو اُس کے ہاتھ کچھڑ سے تھڑے ہوئے تھے۔ کوہسن نے قہر بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی ماں کے





اُسے کچھ مقدس الفاظ سننے پڑے تھے۔ اب وہ وقت آن پہنچا تھا جب راہب تین ماہ کے لیے روپوش ہو جاتے ہیں۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے چنانچہ اُس نے ایک سیلی کے ساتھ مشورہ کیا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

وہ صبح دُھوپ کی وجہ سے اچھی لگ رہی تھی۔ اہلی کے درخت میں فاختا میں کوک رہی تھیں۔ ماپا منڈی جانے کے بجائے گھر پر ہی ٹھہری رہی اور اُس نے کھانا پکایا۔ پھر اُس نے غسل کیا اور پاؤں کے انگوٹھوں تک مہکنے لگی۔ اُس نے مکھری ہوئی لٹوں کو اس طرح باندھا کہ اُس کے نین نقش نکھر گئے۔ ماتھے پر نکھرے ہوئے چند بالوں کو اُس نے ’فاختہ کے پروں‘ ایسے انداز میں سجایا۔ اُس نے اپنی ہنوں کو پنسل سے گہرا کیا اور پان چہا کر اپنے ہونٹ خوب سُرخ کر لیے اُس نے سُرخ پھولوں والا ایک سکرٹ پہنا اور اُس پر سفید کپڑے کی جیکٹ زیب تن کی۔ بچوں نے بھی صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے اور گھر کا سامان بندھا پڑا تھا۔ گھر کے صحن میں ایک تیل گاڑی انتظار کر رہی تھی۔ دس بجے کے قریب راہب نمودار ہوا اور اُس کے ہمراہ اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو اُس کے راہبانہ سکول میں پڑھتا تھا۔ جونہی وہ قریب آیا اُسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ ایک مرتبہ پھر یہ مجھ سے راہبانہ زندگی ترک کر دینے کے لیے کہیں گے۔ وہ گھر کے قریب پہنچا تو اُس نے تیل گاڑی دیکھی۔ ڈوہ گھر میں داخل ہوا تو سامان بندھا ہوا دیکھا۔ وہ اُس چٹائی پر بیٹھ گیا جو اُس کی خالہ نے احتراماً بچھائی ہوئی تھی۔ پھر ماپا کو تلاش کرنے لگا۔

خاصی دیر کے بعد ماپا کھانے کی ٹرے ہاتھ میں لیے نمودار ہوئی۔ اُس نے بڑی اداس آنکھوں سے اور دُکھ بھری چال سے کھانا اُسے پیش کیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بہت بنی ٹھنی ہوئی ہے۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر نگاہ کی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈوہ ایسا کیوں کر رہی ہے لیکن وہ یہی سوچتا رہا کہ جب اُس سے راہبانہ زندگی کو چھوڑنے کے لیے کہا جائے گا، اور ماپا ضرور کہے گی، تو ڈوہ کس طرح انکار کرے گا۔ کھانے کے بعد ماپا نے ٹرے اٹھالی اور اُس سے کچھ فاصلے پر بے حد مودبانہ انداز میں عقیدت سے لہریز ہو کر بیٹھ گئی۔ جونہی راہب نے وعظ دینے کے لیے منہ کھولا ماپا نے اپنی خالہ سے کہا: ’خالہ کیا گاڑی بان ابھی تک نہیں آیا؟‘

راہب، جو ابھی وعظ شروع نہیں کر پایا تھا، تیل گاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

’ماپا، یہ کیا ہو رہا ہے؟‘ اُس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

’میں اس مجرّد شخص کو سب کچھ بتا دوں گی۔‘ ماپا نے سر اٹھائے بغیر راہب سے کہا۔

’خالہ اپنے گاؤں واپس جانا چاہتی ہے۔ وہ چلی گئی تو میرے لیے دکاندراری کرنا اور بچوں کو بھی سنبھالنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے میں مجرد شخص سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ مجھے اور بچوں کو خالہ کے گاؤں چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمائے۔ سب سے بڑا بچہ مجرد شخص کے پاس ہی رہے گا۔‘

اُس نے بڑے بیٹے کی جانب ٹھک کر کہا: ’بیٹے تم مجرد شخص کے پاس رہو۔‘  
یہ کہتے ہوئے اُس نے رخسار پر بہتا ہوا ایک آنسو پونچھا۔  
راہب ایک گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

’مجرد شخص اگر چاہتا ہے تو بے شک ساری زندگی راہب کے لبادے میں گزار دے۔ اُس کی صابرعورت کسی نہ کسی طرح زندگی گزار لے گی۔ اُس کی اور مجرد شخص کی دنیا ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک طویل فاصلہ ہے چنانچہ آج کے بعد ان دونوں کے درمیان صرف ایک راہب اور ایک عقیدت مند کا رشتہ ہوگا۔ چونکہ اُس کے دو بچے بھی ہیں اس لیے اگر کبھی اُسے کوئی ایسا شخص ملا جو قابل اعتبار ہو تو وہ شاید اُسے قبول کر لے۔ اسی لیے وہ یہ ساری چیزیں گھل کر بیان کر رہی ہے تاکہ بعد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔‘

راہب نے حیرت سے ایک ہلکی سی آہ بھری۔ ماپانے اپنی آنکھوں کو تھوڑا سا اُوپر اُٹھایا۔ راہب کے ہاتھ اُس کے لبادے پر پھڑپھڑانے لگے۔ وہ ماپا کو دیکھتا رہا۔  
ماپاے اپنا بیان جاری رکھا: ’یہ دونوں کی بہتری کے لیے کیا جا رہا ہے مجرد شخص پوری آزادی کے ساتھ مذہبی قانون پر عمل کرے گا اور اُس کی بے چاری عقیدت مند، اگر اُسے کوئی مرد مل گیا تو، بے چاری۔۔۔۔۔‘

’تمھاری خالہ کے گاؤں میں تو ہر طرف شرابی ہی شرابی ہیں۔‘ راہب کہنے لگا۔  
’میں اپنی عام زندگی کی طرف لوٹ آؤں گا۔‘

ماپا۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ پھر۔۔۔۔۔ کوہسن کی بیوی بن گئی۔

شان احمد  
(ملانیشیا)

## عورت

سینی فرش پر بیٹھی تھی، ٹانگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سختی سے بھیچے ہوئے جیسے پتھروں کی چٹائی بنی ہوتی ہے۔ اُس نے اُداسی سے اپنا سر جھکا دیا۔ وقتاً فوقتاً اُس کی روشن آنکھیں چمکتی تھیں اور کبھی کبھار وہ بڑی مشکل سے تھوک نکلتی۔ باہر ریتیلے صحن میں ہینڈسم نے اپنا سر اٹھایا اور بانگ دینے لگا۔ اُس کی کلفتی تیزی سے ہلی۔ اُس کا باپ گھر کے مرکزی ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا، بانس پاؤں کو اپنے آگے رکھے اور دائیں ٹانگ کو ایک خاص زاویے پر جھکائے ہوئے۔ پان چباتے ہوئے اُس نے صحن میں نگاہ دوڑائی اور پُرانے، گھنے اور سیاہی مائل سبز کید اگسالیوں کے درخت کو پیار سے دیکھا۔ جو اُس کے پہلو میں تھی، نیند سے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ خُر خُر کرنے لگی۔

اُس کی ماں باورچی خانے میں تھی اور وہ کچھ کاٹ رہی تھی جو آگ جلانے والی لکڑی یا ناریل بھی ہو سکتا تھا۔ تب سیٹی نے اُسے کھر درے فرش پر چلتے ہوئے سناؤہ کمرے کے درمیان تک جا رہی تھی۔ گھٹنوں کے بل جھکنے کے بعد ماں نے بے حد کڑواہٹ سے براہ راست اپنے دل کی بات کہہ دی: ”گزشتہ رات چھوٹی خالد اور خالو حاجی رحمت کی جانب سے نیک خواہشات کا اظہار کرنے آئے تھے۔ وہ مقدس شخص تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔“ کیوٹی رنگیتی ہوئی



اُس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ یک دم وہ سینے میں بھیگ گئی اور اُس کی رگیں پھڑکنے لگیں  
 ”شودو۔“ اُس کی ماں چیخنی اور اُس نے اس طرح تالی بجائی جیسے کوئی ”سلاٹ“  
 لڑنے والا ایک مخصوص پوزیشن لیتا ہے۔

سیٹی یک دم کھڑی ہو گئی۔ اُس کی نبض تیز ہو رہی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں  
 گئی اور کھڑکی بند کرنے کے بعد بیٹھ گئی۔ پھر اٹھی اور پھر بیٹھ گئی اور پھر یک دم کھڑی ہوئی اور  
 کھڑکی کھول دی۔ دھان کے سینچے ہوئے کھیت ڈور تک دکھائی دے رہے تھے۔ سیٹی اپنی ٹھوڑی کو  
 دونوں ہاتھوں سے تھام کو بیٹھ گئی۔ کیوٹی کمرے میں آئی اور اُس نے اپنی دم اُس کے نچنے کے  
 ساتھ رگڑی۔ سیٹی نے تھک کر اس بد بخت بلی کو اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا، چکیو کے  
 درخت کی جانب۔ کیوٹی دوہری ہو گئی، ہوا میں اُچھلی اور بھاگتی ہوئی چاول کوٹنے والے پر چڑھ  
 گئی اور وہاں وہ ایک مرتبہ پھر پیچھے مڑی۔

”بد بخت۔“

”سور۔“

اُس نے کھڑکی کے پٹ تراخ سے بند کر دیے۔

سیٹی کمرے کے کونے میں اپنے گھٹنوں کے گرد بازو گسے زار زار روئے جا رہی تھی۔  
 اُس نے اپنے گھٹنوں میں اپنا سر لٹکا لیا اور اپنی ایڑیوں کو ساتھ ملا لیا تاکہ وہ بہت چھوٹی اور حقیر  
 لگے۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ ایک اتھاہ تاریکی میں کھو گئی ہے۔ اُس نے  
 سوچا کہ اگر وقت آنے پر وہ بہت ہی چھوٹی ہو جائے تو وہ کیا کرے گی۔ وہ فرش کے پھٹوں کے  
 درمیان ایک چھلے ہوئے لال بیگ کی طرح ریگ سکتی تھی اور ستون کے راستے زمین پر جاسکتی  
 تھی۔ وہاں کیوٹی اور پینڈسم بھی نہ ہوں گے جو اپنی خوفناک آوازوں سے اُسے تنگ کرتے تھے۔  
 اگر اُس کے پڑ ہوتے تو وہ ناریل کے درخت کی چوٹی پر جا بیٹھتی اور ہوا کے سامنے دوہری ہو  
 جاتی۔ یا پھر سیدھی آسمانوں میں پرواز کر جاتی اور سفید نرم بادلوں کا تعاقب کرتی۔  
 اُس کے بال اُس کی کمر پر لہروں کی طرح بل کھا رہے تھے۔ اُس نے اپنی آنکھیں  
 کھول دیں۔ چھت میں ایک کالے کمرے نے جالابن رکھا تھا۔ سورج کی شعاعیں اس جالے پر  
 پڑتیں تو ہزاروں سنتوں میں بکھر جاتیں سیٹی کھڑی ہوئی اور بے دھڑک الگنی کی جانب چلنے لگی۔  
 اُس نے ایک سارونگ اتار کر اُس کے آخر میں ایک سیب جتنی بڑی گانھ دی اور پھر اُسے ہوا میں



اور اپنے پڑ پھڑ پھڑائے ”لعنت۔“ سیٹی نے چاقو سے ایک پیاز کو کاٹ کر رکھ دیا اور پھر اُس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیے۔

”لعنت۔“

”سیٹی۔“ اُس کی ماں نے اُسے پھر خبردار کیا۔

اُس نے اپنے اُس غصے پر قابو پانے کی کوشش کی جو اُس کے بدن میں اُبل رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ پیاز کو آہستہ آہستہ کاٹی رہی لیکن پھر وہ تیز ہو گئی۔۔۔۔۔ تیز سے تیز تر۔۔۔۔۔ اُس نے کاٹنے والے چاقو کو زور سے دبایا۔

”سیٹی۔“

ہانڈی چولہے پر دھری تھی اور اُبل رہی تھی اور اُس کا ڈھکنا ہل رہا تھا۔ سیٹی کھڑی ہو گئی اُس نے شلیف پر سنتوک کی ڈوئی اٹھا کر ڈھکن کو دھکیلا تا کہ وہ ایک طرف ہو جائے۔ اُس نے ڈوئی کو ہانڈی کے اندر تک ڈال کر خوب بلایا اور اتنا بلایا کہ ہانڈی اپنی جگہ سے ہل گئی اور اُبلتا ہوا پانی آگ پر گر گیا۔

”سیٹی۔“

وہ اب بھی کسی چیز پر حملہ آور ہونے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اُس نے پھر ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ کوئی بھی زندہ شے۔ لیکن ہر شے مُردہ تھی۔ دھات کے پتھے، ڈونیاں، چینی کے چمچ، کچی مٹی کے برتن اور اُن کے ڈھکن۔ اتنے ہی مُردہ اور ہتھیار ڈال دینے والے جتنی کہ وہ خود۔۔۔۔۔ ایک عورت۔۔۔۔۔ ان کے علاوہ واحد زندہ شے اُس کی ماں تھی جو چوکھٹ میں بیٹھی چینی کوٹ رہی تھی۔ ماں کا بدن اس طرح ہل رہا تھا جیسے کسی تیز رو دریا میں اُگا ہوا کوئی تنا ہلتا ہے۔

”میں نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی۔“

آواز اُس کے اندر گونجنے لگی۔ اُس کے شدید غصے اور بوریت کے ساتھ شدید ہوتی ہوئی آواز! اُس کے ذہن میں جو طرح طرح کے خیالات آرہے تھے لکڑی کی جالی کی طرح آپس میں جڑے ہوئے تھے اور پھر وہ سارے بکھر گئے۔ اُس کی کڑکتی ہوئی آواز اُس کے اندر بند تھی اور اُس کے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کوئی طریقہ نہ تھا کہ وہ یہ بات کر سکے۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔۔۔۔۔ بالکل کچھ نہ تھا۔۔۔۔۔ وہ ایک عورت تھی۔۔۔۔۔









بیٹھ گئی۔ شفق نے ہر شے کو اپنی خوبصورتی سے جکڑ رکھا تھا۔ ہینڈ سم اپنے پنہرے میں میں جا چکا تھا۔ کیوٹی گرنے کے بعد کہیں بھی دیکھی نہیں گئی تھی۔ جانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔

سیٹی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا جسے اس کی ماں نے پکڑ لیا اور سر ہلا کر اپنی بیٹی کے چہرے کو گھورنے لگی۔ اُس کا باپ مُڑا اور ایک جمائی لے کر جال کو ایک طرف رکھ دیا۔

اُس نے سر جھکا لیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے چٹائی کو کھڑپنے لگی۔ اُس نے اپنی زبان ہونٹوں تلے دبا رکھی تھی۔ سیٹی کے لیے ایک روشن مستقبل کا کوئی امکان نہ تھا۔ ہر شے مکمل طور پر سیاہ تھی۔ جہاں تک اُس کے والدین کا تعلق تھا حاجی رحمت کی پیشکش مقدس تھی۔ اور اس قسم کی خوش قسمتی کسی کو کم ہی نصیب ہوتی تھی۔ یہ ایک معجزہ تھا۔ دس برس پیشتر جو بیچ خانہ کعبہ میں بوئے گئے تھے وہ سنا ہے کہ یک دم بھولنے اور پھلنے لگے تھے۔ اگر یہ بیچ کسی زرخیز زمین میں بوئے جائیں، جو بالکل کنواری ہو، تو پھل بے شمار ہوگا: اس دنیا میں بھی اور اگلی دنیا میں بھی۔

’تمہیں ابھی سے یہ سوچنا چاہیے کہ تمہیں کس کس چیز کی ضرورت ہوگی۔‘ چادریں، پردے، نیکی، ایک چھہروانی۔ رمضان شریف گزرنے کا انتظار مت کرو، عید آئی کہ آئی۔ ہمیں نیاز چڑھانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کچھ تو تیاری کرو۔‘

ماں جہاں تھی وہاں سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ باپ نے اپنا جال اٹھایا اور انگلیوں سے اُسے جانچنے لگا۔ سیٹی بے حد فرمانبرداری سے سر جھکائے چٹائی کو کھینچتی رہی۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ پٹی اُتار دی اور اپنی انگلی کو بائیں مُٹھی میں دبا دیا۔ اُس نے انگلی کو اپنی پوری قوت سے رگڑا۔ وہ بار بار ایسا کرتی رہی۔ اس دوران وہ آرام سے اپنے والدین کے پاس بیٹھی رہی جیسے کچھ بھی نہ ہو۔ خون اور پیپ کا ایک فوارہ پھوٹا۔ اُس نے انگلی کو پھر رگڑا۔ خون اور پیپ بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سے نکل کر اُس کی مُٹھی پر پھیل گئی۔ اُس نے آرام سے پہلو بدلا اور بڑے خوبصورت طریقے سے اپنے بلاؤز کا کنارہ اپنی گود میں گرا دیا۔ اُس نے اپنی خون آلود مُٹھی کو پکڑے میں لپیٹ دیا۔ پھر اُس نے سر جھکا دیا۔ پوری دنیا سُن ہو کر رہ گئی تھی۔

’لالٹیوں کو صاف کرو۔‘

سیٹی نے اپنے ہاتھ کو بڑی احتیاط سے چھپاتی ہوئی اٹھی۔ وہ باور چھا خانے کی طرف چل دی۔ اسے اس حقیقت کا احساس تھا کہ وہ ایک چچے سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں، ایک ڈوٹی یا چینی کا چچ۔۔۔۔۔ ایک مُردہ اور بے حس و حرکت شے!

جو لیس فلورس (علی بیدانو)

(فلپائن)

## عورت

اگنس نے اپنی چھاتی سے بچے کا منہ علیحدہ کیا۔ بچہ اب سو رہا ہے۔ وہ آرام سے سانس لے رہا ہے اور اُس کا سینہ ہولے ہولے اوپر نیچے ہو رہا ہے۔ اگنس نے ایک لمحے کے لیے بچے کے ناک نشتے کی طرف دیکھا اور پھر چٹائی پر لٹا دیا۔ اُس کا ڈھوپ کھایا چہرہ خوش شکل ہے۔ ہونٹ پتلے، ناک اونچی اور بال گھنے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کریمانتو پر گیا ہے۔

ایک روز، اگنس نے یاد کیا، وہ اور کریمانتو قصبے کی منڈی میں ملے تھے۔ اُس زمانے میں وہ سبزیاں فروخت کیا کرتی تھی۔ آلو، پیاز، مولیاں، گو بھی، نمٹا۔ وہ بکثرت نہیں آتی تھی اور اس نے جان لیا تھا کہ کریمانتو کو بھی اس ملاقات کی توقع نہیں تھی۔ وہ دوسری جانب جانے ہی والا تھا کہ اس نے اُسے بلا لیا۔ وہ دانت لچکاتا ہوا اُس کی جانب آیا۔ مونچھیل، خوش روجوان۔ وہ سیاہ اور سفید دھاریوں والی ٹی شرٹ پہنچے ہوئے تھا۔ وہ سوچے بنا بولنے لگی۔ اس ملاقات سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ سننے کے لیے ارد گرد جمع ہو جانے والے کانوں، مجلس آنکھوں اور لبوں کی تحارت آمیز مسکراہت سے بے نیاز بولے چلی گئی۔

”تم لڑکے سے ملنے کے لیے بھی نہیں آئے۔“

”یہ لڑکا کون ہے؟“ کریمانتو نے غصے میں پوچھا۔

”ہمارا بچہ اور کون؟ مجھ سے تمہارا بیٹا۔“

کر یا توتو شرما گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا پھر اس پر زردی چھا گئی۔ غصے میں آ کر اُس نے اُن لوگوں کی طرف دیکھا جو تماشا دیکھنے کے لیے کھڑے تھے۔ کر یا توتو قصبے کا سپاہی ہے۔ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے پانچ بچے ہیں، تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔

”یہ عورت پاگل ہے۔“ کر یا توتو بڑبڑایا اور جانے کے لیے مُڑا۔

”لڑکا پیار ہے۔“ اُس نے پھر کہا، ”اُس کو بخار آ رہا ہے۔“

کر یا توتو خریداری کے لیے آئے ہوئے لوگوں کے جھوم میں غائب ہو گیا۔ چہرہ چھپانے کے لیے اُس نے اپنی نظریں اُن چیزوں پر جھکا لیں جنہیں وہ فروخت کر رہی تھی۔ بانس کے چھابے میں گوبھی، آلو، ٹماٹر، مولیاں پڑی تھیں اور پیاز کا ایک ڈھیر اس اخبار پر دھرا تھا جو اُس نے بگری کے گندے فرش پر بچھا رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ اُس کے رخسار گندے تھے اور آنکھوں میں اداسی تھی۔ اس کے بال جڑے ہوئے تھے اور ہوا میں اُڑتے تھے۔ اُس نے سامنے بیٹھی عورت کی طرف دیکھا جو اسی کی طرح سبزیاں بیچتی تھی اور اُسے دیکھ رہی تھی۔ دوسری عورت نے شرمندہ ہو کر نظریں پھیر لیں۔

اس نے نظریں پڑا کر دیکھا باقی لوگ بھی اُس کی جانب دیکھ رہے تھے لیکن اس نے اُنہیں نظر انداز کر دیا۔ وہ خریداروں کو بلانے کے لیے آواز لگاتی رہی۔ اس کے زندہ رہنے کے لیے یہ چھوٹا سا کاروبار بہت اہم تھا۔ وہ گھر چلی گئی۔ اُس نے دیکھا اُس کی چھ سالہ بڑی بیٹی سالی کی گود میں بچہ روئے چلا جا رہا تھا۔

پچھلے برس جشن کے دوران اُس کی کر یا توتو سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ چوک کے قریب باسکٹ بال کورٹ کے قریب کھڑی تھی جسے رقص گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا اور وہ رقص کرتے ہوئے جوڑوں کو دیکھ رہی تھی کہ اُس نے کر یا توتو کو اپنی جانب کچھ عجیب نظروں سے نکتے ہوئے دیکھا۔ جب اُس نے کر یا توتو کی طرف اوپر دیکھا تو اُس کی ٹھوڑی اُس کے بالوں کو چھو رہی تھی۔

رقص بہت پُر لطف تھا۔ اگنس بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کا تہقہ بلند تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ سپاہی آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا ہے یہاں تک کہ اُس کا پیٹ اُس کی کمر کو چھونے لگا۔ اُس نے کر یا توتو کے سینے کی گرمی کو اپنی رگوں میں ریگتے ہوئے محسوس کیا اور اُس کے سانس اس کے بالوں پر تھے۔ ایک عجیب سی گرمی اُس کے جسم اور قلب میں سرسرائی۔ وہ رقاصوں کو



جا چکا تھا۔

اپنے وعدے کے مطابق کرینا تو اُس کے ہاں آیا۔ وہاں سالی کے علاوہ کوئی نہ تھا اور وہ ابھی بہت چھوٹی معصوم تھی۔ سالی کا باپ ایک مچھیرا تھا۔ وہ پالاوان میں مچھلیاں پکڑنے گیا اور تین برس سے نہ وہ خود آیا تھا اور نہ ہی اُس کا کوئی خط۔ اُس کا جھونپڑا کیلے کے ایک گھنے ٹھنڈ میں پوشیدہ تھا۔ اُس کے جھونپڑے کے عقب میں گھنی گھاس کی ایک چراگاہ تھی۔ کرینا تو تین یا چار مرتبہ اس کے ہاں آیا۔ کبھی وہ دو پہر سے لے کر شام تک وہاں رہتا اور کبھی وہ صبح آ کر دو پہر کو چلا جاتا۔ ایسے موقعوں پر وہ سالی کو اسکی دادی کے پاس بھیج دیتی جو دریا کے پار رہتی تھی اور وہاں وہ اپنے رشتے دار بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ وہ اور پولیس میں اکیلے رہ جاتے۔ کرینا تو پُر جوش عاشق ثابت ہوا۔ وہ اس تعلق کو محبت کا رشتہ سمجھی۔ اُس کے لیے کبھی جذبے محبت سے عبارت تھے۔ حتیٰ کہ وہ حاملہ ہو گئی۔ وہ اپنے چوتھے مہینے میں تھی جب اُسے معلوم ہوا کہ کرینا تو شہر چلا گیا ہے۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ یہ اُس کی سمجھ سے باہر تھا۔

ایک طویل جدائی کے بعد وہ دوبارہ اسی پُر جوم مارکیٹ میں ملے تھے لیکن کرینا تو بہت بدل چکا تھا۔ اگنس نے اس تلخی کو اپنی ذات تک رہنے دیا۔ اب تاریکی اتر رہی ہے۔ کھڑکی، جس کے پٹ لکڑی کے ایک ٹکڑے پر لگے ہوئے تھے، کھل گئی تھی اور اگنس اُس میں سے آس پاس کی چیزوں کے ہولے دیکھ رہی تھی۔ کیلے کے درختوں کے ہولے۔ پتے، تنے اور پھر اُس نے چھوٹے چھوٹے کیلوں کے گچھے کو دیکھا۔ اگنس نے سالی کو چاول پکانے کے لیے آواز دی۔ دوبارہ وہ بارہ کسی نے جواب نہ دیا۔ اگنس غصے میں آ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کے نیچے رکھے ٹکڑے کے ٹکڑے کو اٹھا لیا۔ پٹ فوراً گر گئے۔ اُس کا بچہ، جسے بخار تھا، جاگ گیا اور رونے لگا۔ اگنس نے لعن طعن کرنی شروع کر دی۔

وہ بچے کے ساتھ لیٹ گئی اور اپنی چھاتی کو، جو پہلے سے برہنہ تھی، اُس کے منہ میں دے دیا۔ بچہ چپ ہونے پر مجبور ہو گیا۔ وہ سانس بڑی مشکل سے لے رہا تھا لیکن اگنس چھاتی کو اُس کے منہ میں گھسیڑے رہی۔ اگنس نے اپنے بازو پر اُس کے بدن کی شدید گرمی کو محسوس کیا۔ ایک دم اگنس کے دل میں جمع ساری تلخی اُبل کر باہر آ گئی۔ اُسے کرینا تو یاد آیا، برانڈ ویڈیا۔

اُس کا خاندان بڑا بڑا تھا؟ شاید ابھی تک پالاوان میں۔ شاید اُس نے وہاں شادی کر لی ہے۔ خدا کرے کریسٹو پر بچلی گرے، برانڈو پر بچلی گرے اور زندگی پر بچلی گرے۔

’سالی۔۔۔۔۔ سالی۔‘ اگنس کی آواز گونجی۔ ’تم کہاں ہو۔۔۔۔۔ میری بچی۔۔۔۔۔ ذرا بٹھرو میں تمہیں مزا چکھاتی ہوں۔ میں ذرا تمہیں پکڑ لوں۔۔۔۔۔ میں تمہاری چمڑی ادھیڑ دوں گی۔۔۔۔۔ سالی۔۔۔۔۔ سالی۔‘ اگنس اُسے پکارتے بیزار ہو گئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ صرف کیلوں کے پتوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی جو ہوا چلنے سے ہلتے تھے۔ اور اندر کوگون کی چھت کے پڑنے کلڑے آواز دے رہے تھے۔ چھت اب گرنے ہی والی تھی۔ کوگون کھاس کا ایک تڑکا اگنس کے چہرے پر گرا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کے ساتھ ہی ایک تڑکا اُس کی ناک پر آگرا۔ ہوا، اور دو پہر کی ہوا میں پتوں کی سرسراہٹ۔ اگنس کے اُلٹے جذبات کی جگہ اب تنہائی نے لے لی تھی۔ وہ شفق کی نرم اور شینق آوازوں کو سنتی رہی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس نے اُن میں اذیت کی جبین محسوس کی۔

شاید کچھ دیر کے لیے اگنس سو گئی تھی کیوں کہ ایک آواز سننے پر وہ بیدار ہو گئی۔ نیچے سے ایک مردانہ آواز آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے اگنس نے اپنے حواس جمع کیے۔ یہ آواز اس کے لیے نئی تھی۔ اُس نے اسے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ یہ گہری اور رازوں سے بھری تھی۔ اس آواز میں اس کے لیے کوئی عجیب سی چیز تھی۔ اگنس بانس کے ٹھنڈے فرش سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے احساس ہوا کہ جھوپڑے کے اندر تو تاریکی چھا چکی ہے۔ وہاں روشنی نہ تھی۔ اُس نے تیل کے لیپ کو تلاش کیا اور شہتیر پر رکھی ماسک کو ٹولا لیکن ڈبہ بہت ہلکی تھی۔ خالی۔ بالآخر اُس نے پُرانا دروازہ کھول دیا۔

’شام بخیر، ڈے۔‘ نیچے سے آواز آئی۔ مرد کے ایک ہاتھ میں سگرٹ چل رہا تھا جو اگنس نے دیکھ لیا۔ وہ مرد کو گھورتی رہی لیکن اندھیرے میں صرف اُس کا بیوی نظر آ رہا تھا۔ وہ درمیانے قد کا تھا۔ اگنس نے جواب نہ دیا۔ وہ صرف مسکرائی اور اندھیرے میں مسکرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ شخص بیڑھیوں کے قریب آ رہا ہے۔ اُس نے پہلی بیڑھی پر قدم رکھ کر جھوپڑے کے اندر جھانکا۔ اگنس کا ایک ہاتھ دروازے کے ایک حصے پر بوجھ ڈال رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا سگرٹ تھامے اُسے ادھر کر رہی تھی۔

’میں تو صرف یہ جانتا چاہتا ہوں، ڈے، کیا تم بیوا نچو نگ کو جانتی ہو۔ انچو نگ



لپس۔“ اس آدمی نے پوچھا۔

”اچھا، وہی ٹیوانچونگ جو میانگ کا گھر والا ہے؟“

”ہاں۔“

”وہ تو کہیں اوپر رہتے ہیں۔“

”کتنی دور؟“

”پانچ کلومیٹر۔“

”اور اگر سڑک کے راستے نہ جائیں تو؟“ مرد نے اپنا سگرٹ پھینک دیا۔

”یہاں سے کچھ فاصلے پر جا کر دریا کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹے رستے سے چلے جاؤ۔“

پھر پہاڑوں اور میدان میں چلتے جاؤ اور راستے میں پوچھتے جاؤ۔ بہتر ہوگا اگر کوئی

تمہیں وہاں لے جائے۔ کیا تم تنہا ہو؟“ میں ابھی شہر سے آ رہا ہوں۔ ہم نے اس کی زمین کے

سلسلے میں آپس میں کوئی معاملہ طے کرنا ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ، ڈے، میں چلتا ہوں۔“

وہ آدمی جانے کے لیے مُڑا اور جب اگنس نے یہ دیکھا تو ایک سوئی اُس کے دل کو

چھیدنے لگی۔

”کیا آپ اندر نہیں آئیں گے، جناب؟“

وہ ٹھہر گیا۔ ”مجھے جانا ہے۔ ہاں، کیا پانی مل سکتا ہے؟ کہیں پیاس راستے میں مجھے

تنگ نہ کرے۔“

اگنس نے قدم اندر بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی دیر کے لیے اوپر آ جائیں

جناب۔“

اندر تارکی جھونپڑے کو اپنی پیٹ میں لے چکی ہے۔ مرد نے دروازے میں جھانکا۔

اُس نے اپنے دونوں بازو سب سے اوپر والے تختے پر رکھے۔

”معاف کیجئے جناب، صرف ایک منٹ میں مٹی کے تیل کا لیمپ جلاتی ہوں۔“

اگنس نے جھوٹ بولا۔ مرد نے اپنی قمیض کی جیب میں سے ماچس نکالی اور ایک تیلی

جلائی۔ جھونپڑے کا اندرونی حصہ مدہم روشنی میں واضح ہونے لگا۔ ہوا کے جھونکے نے لرزتے

ہوئے شعلے کو بجھا دیا۔

”ڈے، یہ ماچس ہے۔ لگتا ہے تمہیں مُشکل پیش آ رہی ہے۔ لیمپ یہاں لے آؤ۔“

’’نہیں کوئی مشکل نہیں۔‘‘

مرداب بیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ سب سے اوپر والے زینے پر بیٹھ گیا۔ اگنس نے اُسے لیمپ دیا جسے اُس نے روشن کر دیا۔

’’میری ڈیبا بالکل خالی تھی۔‘‘ اگنس نے کہا۔

ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور لیمپ بھی گُل ہو گیا۔ اُس لمحے اگنس جھونپڑے کے کونے کی طرف چل پڑی تھی جہاں چولہے کے نزدیک مٹی کا برتن پڑا ہوا تھا۔ وہ برتن کا ڈھکنا اتار کر پانی نکالنے لگی۔ وہ واپس آئی تو وہ مردہ بے ڈھنگے پن سے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے ہوا کو روکنے کے لیے دروازہ بند کر دیا تھا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی۔

’’تم اپنے بچے کے ساتھ یہاں اکیلی رہتی ہو؟‘‘

لیمپ کے نسبتاً بڑے شعلے میں وہ مرد کا جسم زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے ایک سفید قمیض اور بچو تے پاجن رکھے تھے۔ بال فوجی طرز کے کئے ہوئے تھے۔ وہ درمیانی عمر کا تھا یعنی چالیس کے قریب۔ بے شک نوجوان نہیں تھا لیکن اب بھی خوش شکل تھا۔ اُس کے کندھے چوڑے اور ناک اونچی تھی۔ جب اگنس نے اسے پانی کا پیالہ پکڑا یا اُس کی گہری اور گھب جانے والی نگاہ اگنس کو متاثر کر گئی۔ مرد نے پانی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ اگنس اُس کے گلے کے ہلنے سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ اُس کے خیال میں یہ شخص خاصا کھاتا پیتا تھا۔ وہ خوش لباس اور خوش اخلاق تھا اور بقول اُس کے وہ ٹیوانچونگ کی زمین کے سلسلے میں آیا تھا۔

مرد نے خالی پیالہ اگنس کو تھما دیا۔ ’’ڈے، تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تمہارے علاقے

کا پانی بہت میٹھا ہے۔‘‘ اگنس مسکرائی۔ ’’اور تمہارا خاوند، وہ کہاں ہے؟‘‘

’’قریب ہی ٹیوانچونگ ہے، وہیں ہوگا‘‘ اُس نے پھر جھوٹ بولا۔

مرد نرمی سے ہنسا۔ اُس کے رخساروں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے نمودار ہوئے۔

’’تو فارم میں اس طرح ہوتا ہے۔‘‘ اگنس بچے کے قریب بیٹھ گئی۔ اُس نے پیالہ

اپنے پاؤں کے قریب رکھا۔ ’’تمہارا محافظ تو سوچکا ہے۔‘‘ مرد نے کہا۔

’’اسے بخار ہے اس لیے۔‘‘

’’شاید یہ دانت نکال رہا ہے اس لیے۔‘‘

’’شاید‘‘ اگنس نے ہتھیلی بچے کے ماتھے پر رکھ کر کہا۔

”اس کی عمر کیا ہے؟“

”تقریباً چھ ماہ۔“

اُن کے درمیان خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ ایک کڈھب خاموشی کا وقفہ۔ اگنس نے محسوس کیا کہ مرد اُس کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے۔ اُس نے آہستہ سے اپنی ٹھوڑی اٹھائی۔ اپنے ساتھی کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُس نے محسوس کیا اُس کا بدن ہولے ہولے ہٹکنے لگا ہے۔

مرد نے حرکت کی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ دروازہ کھولنے کے لیے اٹھایا۔ اگنس کے دل کو جیسے کسی نے مسل کر رکھ دیا۔

”تو ڈے، میں اب زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔“ اُس نے کہا، ”ایک بار پھر بہت

شکریہ۔“

”ہاں،“ اگنس نے کہا۔ بعد میں وہ اس پر بہت پچھتائی۔ مرد دروازہ کھول چکا تھا۔

اگنس نے اس کی چرچا ہٹ سنی۔ اُسے کچھ کھودینے اور ناکامی کا شدید احساس ہوا۔ مرد بیڑھیوں کے عین اوپر کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ اور آدھا جسم باہر کی تاریکی میں گم ہو چکا تھا ”جناب“ یہ لفظ کہتے ہوئے اگنس کا گلہ زندہ گیا۔ اُس کی کانپتی ہوئی مدھم آواز صاف سنی جاسکتی تھی۔

مرد ایک دم مڑا۔ اگنس ابھی تک فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی گود کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ اُس نے اپنے کپڑے اُتار دیے اور انجینی کے سامنے برہنہ ہو گئی۔ اُس کی چھاتیاں اور جسم کا بالائی حصہ نظر آنے لگا۔

اگنس نے مرد کی طرف دیکھا۔ اُس نے دوبارہ اُسے پکارا۔ مرد نے اگنس کی طرف دیکھا لیکن حرکت نہ کی۔ اگنس کے ہونٹ اذیت سے گھل گئے۔ ”میرے پاس آ جاؤ۔۔۔ کیا تم سمجھ نہیں سکتے؟ میرا کام تو بس۔۔۔۔۔۔“

اگنس کی آواز میں طلب تھی۔

مرد بالآخر اگنس کے قریب آیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ دیے لیکن اُس میں کوئی گرمی نہیں تھی۔ اگنس نے اپنا چہرہ مرد کے سینے میں چھپا لیا۔ اُس کے بازو اُس کی گردن میں جمائے ہو گئے۔ اُس کا سانس بھاری ہو رہا تھا اور دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ ایک بھنور کی طرف کھینچ رہی تھی لیکن ان سب کے درمیان میں وہ اُس کے ہاتھ کو ایک مضبوط سرد دیوار کی طرح محسوس کر سکتی تھی۔

آخر کار مرد نے اپنی گردن سے اگنس کے ہاتھ ہٹائے۔ اُس نے آہستہ سے عورت کو اپنے سے جدا کیا۔ ”تمہارا بچہ۔“ مرد نے دھیمی آواز میں اُسے یاد دلایا۔ اگنس نے اپنی برہنگی چھپانے کے لیے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے ”تمہارا بچہ۔“ اُس نے دہرایا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور رات کے اندھیرے میں سیاہ پڑ چکی سڑک پر پہنچ گیا۔

ہیاشی فیومیو  
(چاپان)

## ٹوکیو

اُس دو پہر تندر اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ریو اپنا رُک سیک اٹھائے تیزی سے گلی میں چلتی جا رہی تھی۔ وہ اُس جانب ہو کر چلتی تھی جدھر زرد سورج دفاتر کی عمارتوں کی چھتوں پر چمکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ادھر ادھر پُر اشتیاق نظروں سے دیکھتی، کسی عمارت، پارک کی ہوئی کار اور ٹوکیو شہر میں بکھری ہوئی بے شمار جگہوں میں سے ایک کو جہاں ہم گئے تھے۔ ایک اشتہاری بورڈ کے اُوپر سے دیکھتے ہوئے زنگ آلود لوہے کا ایک ڈھیر اُس کی نظروں کے سامنے آیا جس کے ساتھ شیشے کے دروازے والا ایک کیبن تھا۔ اندر آگ جل رہی تھی اور اُس کی آفتیشیں بڑا ہٹ وہاں تک آ رہی تھی جہاں پر وہ کھڑی تھی۔ کیبن کے ساتھ اوور آل پہنے ایک آدمی کھڑا تھا اور اس کے سر پر ایک سُرخ رومال بندھا ہوا تھا۔ اُس شخص کی شخصیت میں ایک خوشگوار تاثر تھا اور ریو نے ہمت کر کے اُسے پکارا:

”میں چائے فروخت کرتی ہوں۔ کیا آپ چائے خریدنا پسند کریں گے؟“

”چائے؟“ اُس شخص نے کہا۔

”جی ہاں“۔ ریو کی مسکراہٹ میں گھبراہٹ عیاں تھی۔ ”شیزوکا چائے“۔

وہ اندر داخل ہو گئی اور رُک سیک کیبن کے قریب رکھ کر اس کی پیٹی کھول دی۔ اندر لوہے کے ایک سٹوڈ میں آگ جلتی نظر آ رہی تھی اور اُس پر ایک کیتلی سلاخ کے ساتھ لٹکی تھی۔ کیتلی

کی تھوٹھی میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔

”معاف کیجئے گا“، ریونے کہا ”اگر آپ بُرا نہ مائیں تو میں اندر آ کر آپ کے سٹود کی مدد سے اپنے آپ کو کچھ گرم کر لوں؟ باہر تو قلعی جم رہی ہے اور میں کئی میل پیدل چل کر آ رہی ہوں“۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، اندر آ جاؤ“۔ اُس شخص نے کہا۔ ”دروازہ بند کر کے اپنے آپ کو گرم کر لو“۔

اُس نے سٹول کی جانب اشارہ کیا جو اُس کیمین کا اکلوتا فرنیچر تھا اور خود ایک بیٹی پر بیٹھ گیا۔ ریو ایک لمبے کے لیے ہچکچائی۔ پھر اُس نے اپنا رُک سیک کیمین کے اندر گھسیٹا اور سٹود کے اوپر بٹھک کر اپنے ہاتھ آگ کی جانب بڑھا دیے۔

”تم اُس سٹول پر زیادہ آرام سے بیٹھ سکوگی“۔ اُس شخص نے کہا اور اُس کے دل فریب چہرے کی طرف دیکھا جو آگ کی تمازت سے سُرخ ہو رہا تھا اور اُس کے لباس پر بھی اُس کی نظر گئی جو بہت ہی معمولی قسم کا تھا۔

”مجھے یقین ہے تم عام حالات میں یہ کچھ نہ کرتیں۔۔۔۔۔ یہی۔۔۔۔۔ در بدر جائے فروخت نہ کرتیں۔“

”جی میں تو اسی طور روزی کماتی ہوں“۔ ریونے کہا۔ ”مجھے بتایا گیا تھا یہ بہترین علاقہ ہے لیکن میں آج صُبح سے یہاں پیدل چل رہی ہوں اور صرف ایک پیکٹ چائے بیچ سکی ہوں۔ میں تو اب گھر جانے کی تیاری میں ہوں لیکن میں نے سوچا کہ راستے میں دو چہرہ کا کھانا کھاتی چلوں“۔

”تم یہاں رُک کر اپنا کھانا کھا سکتی ہو“۔ اُس شخص نے کہا۔ ”اور تم اپنی چائے کے بارے میں فکر نہ کرو“۔ اس نے مسکراتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ”یہ تو قسمت کی بات ہے، ہو سکتا ہے کل تمھاری قسمت پھر سے جاگ اُٹھے“۔

کیتلی نے سیٹی بجا کر پانی اُبلنے کا اعلان کیا۔ اُس آدمی نے جب کیتلی کو سلام سے اُتار تو ریونے کیمین کا جائزہ لیا۔ چھت کا لک سے سیاہ ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے پاس ایک بلیک بورڈ دھرا تھا۔ خاندانی دیوتاؤں کے لیے مخصوص شیلف پر سکا کی کے درخت کا گلا دھرا تھا۔ اُس شخص نے میز پر سے ایک ڈھیلا سا پیکٹ اُٹھایا اور اُسے کھول کر اُس میں سے مچھی کا ایک ٹکڑا نکالا۔

تھوڑی دیر بعد مچھلی کے پکنے کی مہک سارے کیمین میں پھیل گئی۔

”آؤ“۔ اُس شخص نے کہا، ”بیٹھ کر اپنا کھانا کھا لو“۔

ریو نے رُک سیک میں سے اپنا لُچ بکس نکالا اور سٹول پر بیٹھ گئی۔

”جیزیں فروخت کرنا کوئی مزے دار کام نہیں، یا ہے؟“ اُس شخص نے کہا اور مچھلی کو

پلٹنے لگا۔ ”اچھا یہ بناؤ سو گرام چائے سے تم کیا کما لیتی ہو؟“

”اگر میں اسے پینتیس یین میں بیچ لوں تو مجھے کچھ منافع ہو سکتا ہے لیکن جو لوگ مجھے

چائے بھیجتے ہیں وہ اس میں خراب چائے بھی ملا دیتے ہیں چنانچہ اگر مجھے تمیں یین بھی مل جائیں تو

نہیمت ہے“۔ ریو کے لُچ بکس میں دو چھوٹی مچھلیاں تھیں جن پر اُبلے ہوئے جو لگے ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ پھلیوں کا تھوڑا سا اچا رہا تھا۔

اُس نے کھانا شروع کر دیا۔

”تم رہتی کہاں ہو؟“ اُس آدمی نے پوچھا۔

”ہینا یا کے ضلعے میں۔ دراصل مجھے ٹوکیو کے علاقے کا کچھ پتہ نہیں۔ میں چند ہفتے پیشتر

یہاں آئی ہوں اور جب تک کوئی بہتر جگہ نہ مل جائے ایک دوست کے ساتھ رہ رہی ہوں۔

”مچھلی تیار تھی اُس نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا اور آدھی ریو کو دے دی اور اس

کے ساتھ ایک ٹرے میں کچھ چاول اور آلو بھی ڈال دیے۔ ریو مسکرائی اور شکر یہ ادا کرنے کے

لیے تھوڑا سا تھکی اور پھر اپنے رُک سیک میں سے چائے کا ایک لفافہ نکال کر اُس میں سے تھوڑی

سی چائے ایک کاغذی رومال پر ڈال دی۔

”اسے کیتلی میں ڈال دیں“۔ اُس نے کہا اور چائے اُس کی طرف بڑھادی۔

اُس نے اپنا سر ہلایا اور مسکرایا۔ اُس کے سفید دانت نظر آنے لگے۔

”نہ، نہ یہ تو بہت مہنگی ہے“۔

ریو نے جلدی سے ڈھکن اُٹھا کر چائے کیتلی میں ڈال دی اور اُسے اتنا وقت نہ دیا کہ

وہ اُسے روک سکے۔ ہنستے ہوئے وہ شخص شیلف کی طرف گیا اور وہاں سے چائے کی ایک پیالی اور

ایک مگ اُتار لایا۔

”تمہارا خاوند کہاں ہے؟“ وہ مگ اور پیالی کو پیٹی کے اوپر سجاتا ہوا بولا۔ ”تم

شادی شدہ ہونا؟“

’ہاں بالکل ہوں۔ میرا خاوند ابھی تک سا بھرا میں ہے۔ اسی لیے مجھے اس طرح

کام کرنا پڑتا ہے‘۔

ریو نے اپنے خاوند کے بارے میں سوچا جس کی پچھلے چھ برس سے کوئی خبر نہ آئی تھی اور اب تو وہ اتنا دور دراز لگتا تھا کہ اُس کی شکل یا اس کی شنا ساز کو یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور دینا پڑتا تھا۔ وہ ہر صبح اکلا پے اور خالی پن کی کیفیت کے لیے بیدار ہوتی۔ کئی بار اُسے یوں لگتا جیسے اُس کا خاوند سا بھرا کے بر فانی ماحول میں مجھد ہو کر ایک بھوت کا روپ اختیار کر چکا ہے۔ ایک بھوت یا ایک پتلا اور سفید ستون یا پھر بر فانی ہوا کا ایک سانس۔ اُن دنوں جنگ کے بارے میں کوئی بھی گفتگو نہیں کرتا تھا اس لیے اسے یہ بتاتے ہوئے بڑی شرم آتی تھی کہ اُس کا خاوند ابھی تک ایک جنگی قیدی ہے۔

’یہ تو بہت عجیب بات ہے‘۔ اُس شخص نے کہا۔ ’درحقیقت تو یہ کہ میں خود بھی

سا بھرا میں تھا۔ میں دریائے آمو کے قریب تین برس تک لکڑیاں کاٹتا رہا تھا۔ میں تو ابھی مشکل سے پچھلے برس گھر واپس آیا ہوں۔ بس یہ تو قسمت کی بات ہے تمہارے خاوند کی یہ بد نصیبی ہے۔۔۔۔۔ اور تمہاری بھی!‘

’اچھا تو تم واقعی سا بھرا سے واپس بھیجے گئے ہو۔ تم پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا‘۔ ریو

نے کہا۔

’اس کا تو مجھے علم نہیں،‘ اُس نے کندھے اچکائے، ’لیکن، جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو،

میں ابھی زندہ ہوں۔‘

ریو نے اپنا لُنج بکس بند کیا اور اس دوران میں اُس کو غور سے دیکھا۔ اس شخص میں

ایک ایسی سادگی اور سیدھا پن تھا کہ وہ اس کے ساتھ کھل کر باتیں کرنا چاہتی تھی حالانکہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ وہ باتیں کرنے سے بچتی تھی۔

’تمہارے بچے ہیں؟‘ اُس نے پوچھا۔

’ہاں۔ ایک چھ سال کا بیٹا ہے۔ اُسے سکول جانا چاہیے لیکن یہاں ٹوکیو میں اُس کی

رجسٹریشن کروانے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ یہ سرکاری کارندے لوگوں کی زندگیاں پیچیدہ

بنانے کافن جانتے ہیں‘۔

اُس شخص نے اپنا رومال کھول کر پیالی ادنگ کو پونچھا اور بھاپ اُڑاتی چائے اُنڈیل



دی۔

”بڑی عمدہ چائے ہے۔“ اس نے ایک پر شور چسکی لیتے ہوئے کہا۔  
 ”پسند آئی ہے؟ یہ بہترین کوالٹی تو نہیں ہے، تھوک میں دوسودسین کی ایک رکلو ہے  
 لیکن تم دوست کہتے ہو، یہ عمدہ ہے۔“

اُن کی گفتگو کے دوران میں ہوا میں تیزی آچکی تھی اور کیمین کی ٹین کی چھت پر وہ  
 بیٹیاں بجاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ریونے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ اپنے آپ کو گھر تک کی لمبی  
 مسافت کے لیے تیار کر رہی تھی۔

”مجھے تمھاری چائے چاہیے ساڑھے سات سوگرام۔“ اُس نے کہا اور اپنے اوور  
 آل کی جیب میں سے سوسو کے مڑے مڑے دو نوٹ نکالے۔

”تم تو یہ تو فون ایسی باتیں کرتے ہو۔“ ریونے کہا، ”تم اسے بالکل مفت لے سکتے  
 ہو۔“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ یوں نہیں چلے گا۔ کاروبار آخر کار رو بار ہے۔“ اُس نے  
 زبردستی پیسے اُسے تھما دیے۔

”اور اگر تم کبھی دوبارہ ادھر آؤ تو ذرا گپ شپ کے لیے آ جانا۔“

”میں آنا پسند کروں گی۔“ چھوٹی سی کیمین پر نظر ڈالتے ہوئے ریونے کہا۔

”لیکن تم یہاں تو نہیں رہتے؟“

”میں بالکل بیہیں رہتا ہوں اور اس لوہے کی حفاظت پر مامور ہوں اور اسے ٹرکوں

پر لادنے میں مدد کرتا ہوں۔ میں تقریباً سارا دن بیہیں ہوتا ہوں۔“

اُس نے شیف کے نیچے سے ایک دروازہ کھولا اور ایک چھوٹی سی ڈبہ نما جگہ میں ایک

بستر بڑی صفائی سے چھا دکھائی دیا۔ ریونے دیکھا دروازے کی پشت پر کسی اداکارہ کی رنگین

تصویر چپاں ہے۔

”تم نے تو بہت اچھا انتظام کیا ہوا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم تو یہاں

خاصے آرام سے ہو۔۔۔۔۔۔ نہیں؟“

پھر وہ اس کی عمر کے بارے میں سوچنے لگی۔

اُس روز کے بعد سے ریو باقاعدگی سے یوٹ سوگی چائے فروخت کرنے کے لیے

آنے لگی۔ اور ہر بار وہ ہم کی جگہ پر بنی ہوئی کیمین میں ضرور آتی۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس آدمی کا نام ٹروشی یوشیو ہے۔ تقریباً ہر بار اُس کے پاس کوئی چھوٹی سی مزیدار شے ہوتی جو ریو کے لُج بکس کے لیے ہوتی: آڑو کا اچار، بڑے گوشت کا ایک ٹکڑا، ساڑھین مچھلی اور اسی قسم کی مزیدار چیزیں۔ ریو کا کاروبار بہتر ہونے لگا اور اس علاقے میں کئی لوگ اُس کے باقاعدہ گاہک بن گئے۔ اُس کی پہلی ملاقات کے پُرے ایک ہفتے کے بعد وہ اپنے لڑکے ریو کیجی کو ساتھ لے آئی۔ ٹروشی نے تھوڑا دیر لڑکے کے ساتھ گپ شپ لگائی اور پھر اُسے سیر کے لیے لے گیا۔ وہ لوٹے تو ریو کیجی ایک بڑا کریمیل ایک اٹھائے ہوئے تھا۔

’تمہارے اس لڑکے کا معدہ بہت اچھا ہے‘۔ ٹروشی نے لڑکے کے چھوٹے چھوٹے بالوں پر تھپکی دے کر کہا۔

میرا یہ نیا دوست شادی شدہ ہے یا نہیں، اکثر ریو یہ سوچتی۔ یہی نہیں وہ اُس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بھی غور کرتی رہتی۔ وہ انتیس برس کی ہو چکی تھی۔ ایک دم اُسے احساس ہوا کہ اپنے خاندان کے بعد وہ پہلی مرتبہ کسی دوسرے مرد میں دلچسپی لے رہی ہے۔ ٹروشی کو اپنی اس دلچسپی کے بارے میں خبر نہ ہونے دی۔

کچھ دنوں بعد ٹروشی نے ریو اور ریو کیجی کو چھٹی کے روز اساکو سا دکھانے کی پیشکش کی۔ اُونٹوشین کے معلوماتی کھوکھے کے سامنے وہ ایک دوسرے سے ملے۔ ٹروشی ایک پرانا سرمئی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا جو اب بہت تنگ ہو چکا تھا۔ ریو نے کیونو کا نیلے رنگ کا لباس اور اُس پر ایک ہلکے بھورے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس عام اور سستے لباس کے باوجود اُس پُر جھوم شیشن میں کھڑے ہوئے وہ بہت نوجوان اور باوقار لگ رہی تھی۔ دراز قامت اور بھاری تنوتوش کے مالک ٹروشی کے ساتھ وہ سکول کی بچی لگی رہی تھی جو چھٹیاں منانے جا رہی ہو۔ اُس کے شانگ بیگ میں اُن کا دوپہر کا کھانا تھا۔ روٹی، مالٹے اور چاولوں سے بھری ہوئی سمندری گھاس۔

’اُمید تو ہے کہ آج بارش نہیں ہوگی‘۔ ٹروشی نے کہا اور ریو کی کمر کے گرد اپنا بازو ڈال کر اُسے جھوم سے باہر لے جانے لگا۔

اُنھوں نے اساکو سا شیشن کے لیے زیر زمین گاڑی پکڑی۔ پھر بیدل چلتے ہوئے ماتسویا ڈیپارٹمنٹ سٹور سے سینکڑوں چھوٹے شالوں سے گزرتے ہوئے بن بنٹو گیٹ تک پہنچے۔

اسا کوسا کا ضلع ریو کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ جب سُروش نے ایک سُرخ مندر کی جانب اشارہ کر کے اُسے بتایا کہ یہ اساکوسا کی رحم کی دیوی کا گھر ہے تو وہ بے حد حیران ہوئی۔ دُور سے بگل اور سیکسا فون کی آواز آرہی تھی جو لاڈ ڈپیکر کے ذریعے ان تک پہنچ رہی تھی۔ یہ آوازیں سکا کی قدیم درختوں میں سے گزرتی ہوا کے ساتھ مل کر عجیب تاثر پیدا کر رہی تھیں۔

وہ ہُانے کپڑوں کی منڈی کے راستے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں خوراک کے سٹالوں کی ایک قطار تھی جو اساکوسا تالاب کے کنارے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے کھڑے تھے۔ یہاں فضا میں تیل کے جلنے کی بو تھی۔ سُروش نے ایک سٹال سے ریو کیجی کے لیے زر میٹھی روٹی خریدی۔ وہ تینوں ایک تنگ گلی میں چل رہے تھے جس کے دونوں جانب امریکی طرز کے اشتہاری بورڈ لگے ہوئے تھے جو ریستورانوں اور فلموں کے بارے میں تھے۔ لڑکا روٹی پر منہ مارتا مزے سے ساتھ چل رہا تھا۔ ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا جب ریو نے سُروش کو پہلی بار اُس کے کیمین کے باہر دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اُس کی رفاقت میں یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اُسے ایک عرصے سے جانتی ہو۔

”تو آخر کار بارش شروع ہو ہی گئی“۔ اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ریو نے اوپر دیکھا تو سلیٹی رنگ کے آسمان سے بارش کے اکاڈ کا قطرے گر رہے تھے۔ ”ہماری قیمتی پینک برباد ہو جائے گی“۔ اُس نے سوچا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم اُس دکان کے اندر چلے جائیں“۔ سُروش نے ایک ایسی دکان کی طرف اشارہ کیا جس کے باہر ایک شوخ لائٹن لٹک رہی تھی اور اُس پر ”میری ٹی ہاؤس“ کے الفاظ لکھے تھے۔ جس میز پر وہ بیٹھے اُس کے اوپر چھت پر مصنوعی چیری کے شگوفے سجے ہوئے تھے۔ یہ جگہ ان کے مزاج کی ہرگز نہ تھی لیکن وہ ایک اچھا دن گزارنے پر نٹلے ہوئے تھے۔ لہذا اُنہوں نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ ریو نے اپنی روٹی، مالٹے اور بھری ہوئی سمندری گھاس تقسیم کی۔ اُن کا کھانا بہت جلد ختم ہو گیا اور اس دوران میں تیز بارش تیز تر ہو گئی۔

”جب تک یہ رک نہیں جاتی ہم یہیں انتظار کر لیں تو بہتر ہے“۔ سُروش نے مشورہ دیا۔ اس کے بعد میں تمہیں گھر لے جاؤں گا“۔

ریو کے ذہن میں آیا کہ پتا نہیں وہ اپنے گھر کے بارے میں کہہ رہا ہے یا میرے گھر کے بارے میں۔ وہ اپنے آبائی قصبے کی ایک دوست کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی اور اُس کے پاس تو



موٹی سویوں کے دو پیالوں کا آرڈر دیا اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ٹروشی ریو کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے وہ تاریک اور بارش سے بھرے آسمان کو دیکھتے رہے۔

”تمھاری عمر کیا ہے ریو؟“ ٹروشی نے اُس سے پوچھا ”میرا خیال ہے کہ پچیس برس کے قریب؟“ ریو نے لگی۔ ”نہیں ٹرو، میں تو بوڑھی ہو چکی ہوں، تقریباً اٹھائیس برس کی۔“

”اچھا! تو تم مجھ سے ایک سال بڑی ہو۔“

”حیرت ہے تم مجھ سے چھوٹے ہو۔“ ریو نے کہا، ”میرا تو خیال تھا کم از کم تیس برس کے ہو گے۔“

اُس نے اُس کی سیاہ اور نرم آنکھوں میں دیکھا جن کی بھنویں بے حد گھنی تھیں۔ لگتا تھا ڈھڈھ مارا ہے۔ پھر ڈھڈھکا اور اپنی گیلی جرابیں اتارنے لگا۔

بارش رکے بغیر جاری رہی۔ اس دوران ملازمہ ٹھنڈی سویاں اور سوپ لے کر آئی ریو نے اپنے بیٹے کو جگا کر اسے سوپ کی ایک پلیٹ دی۔ ڈھڈھ اُس کی چسکیاں لیتے ہوئے بھی تقریباً سو رہا تھا۔

”ریو؟“ ٹروشی کہنے لگا، ”یہ بہتر ہے کہ ہم رات اسی سرائے میں گزار لیں۔ تم اتنی شدید بارش میں گھر کیسے جاسکتی ہو؟“

”ہاں،“ ریو نے کہا، ”تم درست کہتے ہو۔“

ٹروشی کمرے سے باہر گیا اور جب واپس آیا تو اُس کے پاس بہت ساری رضائیاں تھیں جو اُس نے فرش پر بچھا دیں۔ ایک دم ایسا محسوس ہوا جیسے سارا کمرہ بستروں سے بھرا ہوا ہے۔ ریو نے اپنے بیٹے کو ایک رضائی میں لپیٹ کر تھکی دی۔

وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ پھر اُس نے روشنی گل کر کے کپڑے اتارے اور لیٹ گئی وہ ٹروشی کے لیٹنے اور کپڑے بدلنے کی آواز سن رہی تھی۔

”میرا خیال ہے ان سرائے والوں کا تو یہی خیال ہوگا کہ ہم شادی شدہ ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد ٹروشی نے کہا۔

”ہاں شاید۔۔۔۔۔ انھیں یوں بیوقوف بنانا کوئی اچھی بات تو نہیں۔“

اُس نے یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن اب جب ڈھڈھ رضائی میں بے لباس لیٹی تھی اُس

نے پہلی بار اپنے آپ کو کچھ مجرم سا محسوس کیا۔ کسی وجہ سے اُسے اُس کا خاندان کی برسوں بعد اس قدر قریب لگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہاں صرف اس لیے تھی کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کے خیالات ادھر ادھر بھٹکنے لگے اور وہ سو گئی۔

جب وہ بیدار ہوئی تو ابھی بھی اندھیرا تھا۔ اس نے سناٹا روشنی نیند میں اس کا نام دوہرا رہا تھا۔ اسے ایک دھچکا سا لگا اور وہ اٹھ بیٹھی۔

”ریو، کیا تھوڑی دیر کے لیے میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں؟ کچھ باتیں کرنے کے لیے؟“

”نہیں سُرو۔۔۔۔۔“ اُس نے کہا، ”تمہیں نہیں آنا چاہیے۔“  
چھت پر بارش ابھی تک برس رہی تھی لیکن طوفان کی شدت میں کمی آ چکی تھی۔ گٹر سے ایک چھوٹی سی لکیر صحن میں گر رہی تھی۔ بارش کی آواز میں اُس نے شاید سُردوشی کو ایک ٹھنڈی سانس بھرتے سنا۔

”دیکھو سُرو، اُس نے وقفے کے بعد کہا، ”میں نے تم سے آج تک نہیں پوچھا لیکن کیا تم شادی شدہ ہو!“

”نہیں، اب نہیں۔“ سُردوشی نے کہا۔

”پہلے کبھی؟“

”ہاں میں پہلے شادی شدہ تھا جب میں فوج سے واپس آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میری بیوی کسی اور مرد کے ساتھ رہ رہی ہے۔“

”کیا تمہیں۔۔۔۔۔ غصہ آیا تھا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے غصہ آیا تھا لیکن میں اس سلسلے میں کبھی کیا سکتا تھا۔۔۔۔۔ اُس نے مجھے چھوڑ دیا تھا اور بس یہی کچھ ہونا تھا۔“  
وہ چُپ ہو گئے۔

”ہم کس چیز کے بارے میں گفتگو کریں؟“ ریو نے پوچھا

سُردوشی ہنسنے لگا: ”کوئی ایسی خاص چیز تو نہیں ہے جس کے بارے میں ہم گفتگو کر

سکیں۔ وہ سو یاں زیادہ اچھی نہیں تھیں یا اچھی تھیں؟“

”نہیں اُنھیں اچھا تو بالکل نہیں کہا جا سکتا اور انھوں نے ہم سے ایک سوین فی پیٹ

چارچ کیے۔“

”کیا ہی اچھا ہوا اگر تم دونوں کے پاس اپنا ایک کمرہ ہو۔“ نروشی نے کہا۔

”پھر تو ہمارے بھی ٹھاٹھ ہوں۔ کیا ہم تمہارے قریب کوئی کمرہ حاصل کر سکتے ہیں؟

میں تمہارے آس پاس رہنا پسند کروں گی، نرو!“

”ان دنوں کمرے حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے، خاص طور پر شہر میں لیکن میں خیال

رکھوں گا اور تمہیں اطلاع کر دوں گا۔ ریوتم واقعی قابل تعریف ہو۔“

”میں؟“ ریوہنے لگی۔ ”بیوقوفی کی باتیں کرتے ہو۔“

”ہاں تم بہت ہی شاندار اور حیرت انگیز عورت ہو۔“

ریوفرش پریٹ گئی۔ یکدم اُس کا جی چاہا کہ وہ نروشی کو بازوؤں میں جکڑ لے تاکہ

اُس کے بدن کا قرب محسوس کر سکے۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ بولتی تو اُس کی خواہش بولنے لگتی۔ وہ

سانس بھی مشکل سے لے رہی تھی۔ اُس کا پورا بدن کھنک رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر صبح کا پہلا ٹرک

کھڑکھڑاتا ہوا گزر گیا۔

”تمہارے والدین کہاں ہیں، نرو؟“ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

”گلو کا کے نزدیک ایک جگہ۔“

”تمہاری ایک بہن ٹوکیو میں بھی تو ہے۔“

”ہاں۔ وہ بالکل تنہا ہے، تمہاری طرح۔ اُس کے دو بچے ہیں۔“ اُس کے پاس

سلائی کی مشین ہے اور وہ مغربی طرز کے ملبوسات بناتی ہے۔ کئی سال پہلے اُس کا خاوند قتل ہو گیا

تھا۔ چین میں جنگ کے دوران۔ جنگ۔۔۔۔۔ ہمیشہ جنگ۔“

ریو کھڑکی سے صبح کی اولین کرن نظر آنے لگی تھی۔ ان کی ایک شب کی رفاقت بس ختم

ہونے کو تھی۔ اُس نے اداس ہو کر سوچا۔ اُسے شاید اس بات کا انسوس تھا کہ نروشی نے بہت

آسانی سے ہتھیار ڈال دیے تھے لیکن پھر بھی وہ جانتی تھی کہ بہتری اسی میں تھی۔ ہاں اگر وہ ایسا

مرد ہوتا جس کے لیے وہ کچھ محسوس نہ کرتی یا اُسے بالکل نہ جانتی تو شاید وہ اپنے آپ کو بغیر کسی

پچھتاوے کے اُس کے حوالے کر دیتی۔

نروشی کے ساتھ معاملہ بالکل مختلف تھا۔۔۔۔۔ بالکل مختلف۔

”ریو۔۔۔۔۔ مجھے نیند نہیں آرہی۔“ اُس کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ ”میں

جاگ رہا ہوں۔ دراصل مجھے اس قسم کی چیزوں کی عادت نہیں۔‘

’کس قسم کی چیزوں کی؟‘

’یوں کسی لڑکی کے ساتھ کسی کمرے میں سونا‘۔

’ٹرو۔۔۔۔۔۔ یہ تو نہ کہو کہ تم کبھی کسی لڑکی کے ساتھ وقت نہیں گزارتے‘۔

’صرف کاروباری لڑکیوں کے ساتھ‘۔

ریوہنے لگی۔ ’مردوں کے لیے بہت ساری آسانیاں ہیں‘۔

اُس نے ٹروشی کو حرکت کرتے سنا۔ ایک دم وہ اُس کے ساتھ تھا۔ اُس کے اُپر جھکا

ہوا۔ ریوہنے بالکل حرکت نہ کی۔ جب اُس کے بازو اُس کے گرد لپٹے تب بھی وہ خاموش رہی۔

اُس کا چہرہ اُس کے چہرے کو چھو رہا تھا۔ تاریکی میں اُس کی آنکھیں پوری کی پوری کھلی تھیں اور

اُن کے سامنے تیز روشنیاں چمکتی تھیں۔ اُس کے گرم ہونٹ اُس کے رخساروں پر تھے۔

’ریو۔۔۔۔۔۔ ریو‘

’یہ بات غلط ہے‘ اُس نے سرگوشی کی، ’یہ میرے خاوند کے ساتھ زیادتی ہے۔‘

لیکن اُسی لمحے اُسے اپنے لفظوں پر افسوس ہوا۔ ٹروشی اُس پر جھکا تو روشن ہوتے

آسمان کے پس منظر میں اُس کی شبابہت دکھائی دی۔ وہ آگے کو اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے کسی دیوتا

کے سامنے سر جھکائے بیٹھا ہے۔ ریوہنے ایک لمحے کے لیے تامل کیا اور پھر دیکھتے ہوئے بازو اُس

کی گردن میں ڈال دیے۔

دوروز بعد ریوہنے کو لیے ٹروشی سے ملنے گئی۔ جب وہ اُس مقام پر پہنچی جہاں ہم گرا

تھا تو اُسے دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ وہ سر پر سُرخ رومال باندھے اپنے کیمین کے سامنے نہیں

تھا۔ ریوہنے یہ جاننے کے لیے کہ وہ کیمین میں ہے یا نہیں بھاگتا ہوا گیا اور اُسی لمحے واپس آ گیا۔

’وہاں تو اجنبی لوگ ہیں۔۔۔۔۔۔ ماں!‘

ہراساں ہو کر وہ تیزی سے کیمین کی طرف گئی اور اندر جھانکا۔ دو مزدور ٹروشی کا

سامان ایک کونے میں ڈھیر کر رہے تھے۔

’کیا بات ہے خاتون؟‘ اُن میں سے ایک نے گردن موڑ کر پوچھا۔

’میں ٹروشی کو تلاش کر رہی ہوں‘۔

’تصیح علم نہیں کہ۔۔۔۔۔۔ ٹروشی کل مر گیا تھا؟‘



”مرگیا؟“ اُس نے کہا۔ ڈوہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن لفظ اُس کے مُنہ سے نکل نہیں رہے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ خاندان کے دیوتاؤں کے شیلف پر ایک موم بتی روشن تھی اور اب اُسے معلوم ہوا کہ ایسا کیوں تھا۔

”ہاں“۔ مزدور کہنے لگا۔ ”وہ پچھلی شب آٹھ بجے کے قریب مارا گیا۔ ڈوہ لوہے کی سلاخیں پہنچانے کے لیے ایک شخص کے ساتھ ٹرک میں اُمیا گیا اور واپسی پر ایک تنگ پل پر اُن کا ٹرک اُلٹ گیا۔ وہ اور ڈرائیور دونوں ہلاک ہو گئے۔ اُس کی بہن کمپنی کے افسران کے ہمراہ آج اُمیا گئی ہے تاکہ اُسے جلانے کا بندوبست کر سکے“۔

ریونے خالی خالی نظروں سے سامنے دیکھا اور خالی نظروں سے اُن دونوں مزدوروں کو سُروش کی کا سامان ڈھیر کرتے دیکھتی رہی۔ شیلف پر روشن موم بتی کے ساتھ چائے کے دو پیکٹ پڑے تھے۔ ڈوہ ہی پیکٹ جو اُس نے ریونے سے خریدے تھے۔ کیا یہ صرف دو نئے پیکٹ کی بات ہے؟ اُن میں سے ایک گھلا ہوا تھا اور دوسرا بالکل بند تھا۔

”میرا خیال ہے آپ اُس کی دوست تھیں، کیوں خاتون؟ وہ بہت شاندار شخص تھا۔۔۔ سُرو۔۔۔ یہ عجیب بات ہے کہ اُسے اُمیا جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ڈرائیور کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی چنانچہ سُرو کہنے لگا میں سامان اُتارنے کے لیے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔۔۔۔۔ ہے نا پاگل پن۔۔۔۔۔ جنگ سے اور سائبیریا سے بچ کر آ گیا اور یہاں اس طرح مارا گیا“۔

ایک مزدور نے ایکٹرس کی تصویر اُتار کر اس پر پھونک مار کر گرد جھاڑی۔ ریونے کھڑی سُروش کے سامان کو دیکھتی رہی۔ کیتلی، فرائی پان، ربڑ کے جوتے اور جب اُس کی نظریں بلیک بورڈ پر پڑیں تو پہلی بار اُس نے اُس پر سُرخ چاک سے گھسیٹا ہوا ایک پیغام دیکھا، ”ریونے۔۔۔۔۔ میں دو بجے تک تمہارا انتظار کرتا رہا۔۔۔۔۔ شام کولوٹوں گا“۔

بے اختیار وہ دونوں مزدوروں کے سامنے ٹھکی اور رک سیک کر پرکھ لیا۔ کیبن کو چھوڑتے ہوئے اُس کا بدن بے حس ہو چکا تھا۔ ریونے کی بات پر پکڑے جب ڈوہ اُس مقام پر آئی جہاں بم گرا تھا تو جلتے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے اُبل پڑے۔

”کیا وہ آدمی مر گیا، ماں؟“

”ہاں ڈوہ مر گیا“۔ ریونے کہا۔

’وہ کیوں مر گیا؟‘

’وہ دریا میں گر گیا تھا۔‘

آنسو اُس کے رخساروں پر بہ رہے تھے۔ وہ بے احتیاط بہتے چلے جا رہے تھے اور وہ شہر کی گلیوں میں تیزی سے چلتی جاتی تھی۔ دریا ئے سمیدہ کے کمان جیسے ہل کو پار کر کے وہ ماکو ہو کی جانب پیدل چلنے لگی۔

’اگر تم حاملہ ہو جاؤ تو فکر نہ کرنا‘۔ ٹروشی نے اساکو سامنے اُسے کہا تھا۔ ’جو بھی ہو

میں تمہارا خیال رکھوں گا ریو‘۔ اور اُس کے بعد چند ہونے سے پہلے اُس نے کہا تھا، ’میرے پاس کچھ زیادہ پیسے نہیں ہیں لیکن تم مجھے اپنی مدد کرنے دو۔ میں اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ دو ہزار روپے تمہیں دے سکتا ہوں‘۔ وہ ریو کی پکی کو ایک ایسی دوکان میں لے گیا تھا جہاں غیر ممالک کا سامان فروخت ہوتا تھا اور اُسے بیس بال کی کیپ خرید کر دی تھی۔ کیپ پر اُس کا نام لکھا تھا۔ پھر وہ تینوں بے حد خوش گلیوں میں چلتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے جو ہڑوں سے بچتے ہوئے، جو بارش کی وجہ سے سڑک پر بن گئے تھے۔ جب وہ ایک ملک بار کے قریب پہنچے تھے تو ٹروشی انہیں اندر لے گیا تھا اور دونوں کے لیے دودھ کے بڑے گلاسوں کا آرڈر دیا تھا۔

اب اس تاریک دریا کی جانب سے ایک برقی ہوا آ رہی تھی۔ مرعا بیوں کا ایک جھنڈا دوسرے کنارے پر کھڑا تھا تجند اور بُرے حال میں۔۔۔۔۔ سامان ڈھونے والی کشتیاں دریا میں ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔

’ماں مجھے ڈرائیونگ کی کاپی چاہیے۔۔۔۔۔ تم نے کہا تھا مجھے لے دو گی۔‘

’بعد میں۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد‘۔

وہ بیرک نما عمارتوں کی ایک قطار کے قریب سے گزر رہے تھے۔ یہ ذاتی گھر ہوں گے، اُس نے سوچا ان میں جو لوگ رہتے ہیں اُن کے اپنے اپنے کمرے تو ضرور ہوں گے۔ ایک کھڑکی سے ایک رضائی لٹک رہی تھی اور اندر ایک عورت کمرے کی صفائی کرتی نظر آ رہی تھی۔

’چائے خریدیے‘۔ ریو نے آہستہ سے پکارا، ’بہترین قسم کی شی زو کا چائے۔‘

کوئی جواب نہ پا کر ریو نے اپنا فقرہ زور سے دہرایا۔

’مجھے ضرورت نہیں ہے‘۔ عورت نے کہا۔ اُس نے رضائی کھینچ کر اندر کی اور زور

سے کھڑکی بند کر دی۔ ریو نے قطار کے ہر گھر میں آواز لگائی لیکن کسی کو بھی چائے کی ضرورت نہیں

تھی۔ ریو کیجی اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور بڑبڑاتا رہا کہ میں تھک چکا ہوں، میں بھوکا ہوں۔  
ریو کا رُک سیک اُس کے کندھوں میں جھک رہا تھا اور اُسے اُس کی پیٹی دُست کرنے کے لیے اکثر  
رُکنا پڑتا۔ اس کے باوجود اسے یہ جسمانی تکلیف اچھی لگ رہی تھی۔

اگلے روز وہ اکیلی شہر گئی اور ریو کیجی کو گھر چھوڑ گئی۔ جب وہ اُس مقام پر پہنچی جہاں ہم  
گرا تھا تو اُس نے دیکھا کہ کیمین کے اندر آگ جل رہی ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی دروازے تک گئی  
اور اندر گھس گئی۔ سُردشی کے چولہے کے قریب ایک بوڑھا آدمی مزدوروں کا اور کوٹ پہنے بیٹھا  
تھا اور آگ میں لکڑیاں ڈال رہا تھا۔ کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور کھلی کھڑکی سے دھواں باہر  
جا رہا تھا۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“ بوڑھے نے مڑ کر پوچھا۔

”میں شی زو کا چائے فروخت کرنے کے لیے آئی ہوں۔“

”شی زو کا چائے؟ میرے پاس تو بہت اچھی چائے وافر مقدار میں موجود ہے۔“

ریو بغیر کچھ کہے باہر آ گئی۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ سُردشی کی بہن کا پتا دریافت کرے  
گی اور وہاں جا کر اُس کی یاد میں ایک اگر بتی جلانے کی لیکن اُسے یکنخت احساس ہوا کہ یہ سب کتنا  
فضول ہے۔ وہ دریا کی طرف واپس آ گئی۔ پانی پر پھیلے پہرے کا سُورج چمک رہا تھا۔ وہ بجزی کے  
ایک ڈھیر پر بیٹھ گئی۔ کچھ فاصلے پر بلی کا ایک مردہ بچہ اوندھا پڑا تھا۔ اُس کے ذہن میں سُردشی کا  
خیال آیا تو اُس نے سوچا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ کبھی نہ ملے۔ نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ اُسے کوئی  
پچھتاوا نہ تھا۔ اُس سے ملنے یا اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا اُس کا۔ اُسے اس بات کا بھی کوئی دکھ نہیں  
تھا کہ وہ ٹوکیو کیوں آئی تھی۔ جب وہ ایک ماہ پیشتر یہاں آئی تھی تو اُس نے کاروبار کی ناکامی کی  
صورت میں واپس جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن اب وہ جانتی تھی کہ وہ ٹوکیو میں ہی رہے گی، بلکہ  
شاید اسی جگہ، اسی علاقے میں جہاں سُردشی رہا کرتا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی رُک سیک کندھوں پر  
اٹھایا اور پھر سے دریا سے پرے ہونے لگی۔ جب وہ ایک چھوٹی گلی میں گھوم رہی تھی تو اُس نے  
ایک جھونپڑا دیکھا جو لکڑی کے چند تختے جوڑ کر بنا یا گیا تھا۔ وہ دروازے کے قریب گئی اور پکارا  
”چائے۔۔۔۔۔۔ چائے چاہیے؟“ دروازہ کھلا اور ایک ایسی عورت باہر نکلی جس کا لباس ریو  
سے بھی گیا گزرا تھا۔

”کیا بھاؤ ہے؟ عورت نے پوچھا اور پھر رُک سیک دیکھ کر کہنے لگی۔“ چاہو تو اندر

آ کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ میں دیکھتی ہوں میرے پاس کتنے پیسے بچے ہیں۔ شاید اتنے ہوں کہ تھوڑی سی چائے خرید لوں۔“

ریواندر چلی گئی اور اپنا رُک سیک اُتار کر رکھ دیا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں تیل کے چولہے کے گر دھیموں اور جرابوں کے ایک انبار میں سلائی کرنے والی چار عورتیں بیٹھی تھیں۔ یہ میرے ہی جیسی عورتیں ہیں۔ ریوانے سوچا اور سونیوں کو کپڑے کے اندر اور باہر آتے جاتے دیکھتی رہی۔ ایک جدت آفرین احساس اس پر چھا گیا۔

نائی گانگ  
(ملانیشیا)

## سیلز گرل

پرلز بل کے آس پاس تمام گلیاں صبح کی روشنی میں بیدار ہو چکی تھیں۔ تقریباً سات بج رہے تھے۔ رُج کے گھڑیاں نے موسیقی کی دُھن بجائی۔ ہمسائے میں رہنے والی لڑکی اس دنیا کے جی خوش کرنے والے مقامات میں سے ایک میں کبیرے رقا صد تھی اور اپنے تیسرے گاہک کے ساتھ ابھی بستر میں تھی۔ لکڑی کے دیوار کے پیچھے سے نرم اور جنسی قسم کے قہقہے کبھی کبھی سنائی دیتے۔ سامنے والے کمرے میں مادام کوئی کا خاوند رہتا تھا جو اپنے بھڑی کے ڈھیر کے ساتھ کب کا بازار جا چکا تھا۔ البتہ مسٹر وانگ اپنے کمرے میں تھا کیوں کہ بچھلی شب اُس پر کھانسی کا دورہ پڑا تھا اور وہ بلغم کے ساتھ خون تھوکتا رہا تھا۔ شاید وہ آج بھی کام پر نہ جاسکے۔ وہ پھلوں کی دوکان پر نائب خزانچی تھا اور صرف سولہ ڈالر ماہانہ تنخواہ پر کام کرتا تھا۔

لکڑی کی دیواروں کے کمرے کے باہر راہداری میں مشترکہ باورچی خانہ تھا۔ وہاں صرف دو سٹوڈنٹ رہتے تھے۔ رقا صد کی ماں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کچھ سوچ رہی تھی۔ اپنے خیالوں میں بالکل گم تھی۔ اُس کے قدموں میں ایک بلی لیٹی تھی جو اپنی دُم چاٹ رہی تھی۔ اُسے گاہک کے کمرے سے نکال دیا تھا۔

گیز وا بھی اٹھی نہیں تھی۔ اُس کی ماں نے دلے کا ناشتہ تیار کیا تھا اور بہت آہستگی سے کمرے سے آئی تھی تاکہ ہمسایوں کو تکلیف نہ ہو۔ اُس نے اپنی بیٹی کو سرگوشی میں کہا: ’گیزو، سات بج چکے ہیں۔ اٹھو گی نہیں؟‘

لڑکی نے جواب دینے سے انکار کر دیا لیکن صاف ظاہر ہے وہ جاگ رہی تھی۔ بچھلی

شب وہ روتی رہی تھی اور اتنی دیر تک اور پُرشور انداز میں احتجاج کرتی رہی تھی کہ برابر کے کمرے کا گاہک درمیانی دیوار پر دستک دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ فارمیسی میں سیلز گرل کی حیثیت سے کام نہیں کر سکے گی کیونکہ منیجر نے اصرار کیا تھا کہ وہ عام دوائیوں کے ساتھ جنسی دوائیاں مثلاً ”پیاری دوائی“ اور ”چھوٹا عشق“ وغیرہ بھی فروخت کرے اور یہ ایک کنواری اور سولہ برس سے بھی کم عمر لڑکی کے لیے انتہائی معیوب بات تھی۔ وہ تو یہ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری لڑکیاں جو ذرا ڈھیٹ تھیں وہ کر سکتی تھیں۔ وہ اپنے گاہکوں کو ”چھوٹا عشق“ خریدنے کی ترغیب دے سکتی تھیں لیکن اس نے پہلے دن سے نہ تو ان دوائیوں کا نام لیا تھا اور نہ انھیں فروخت کیا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک منیجر کو انکار نہیں کر سکتی چنانچہ اجنبیوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بہتر تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ دے۔ اور اسی لیے گھر بچنے ہی رونے لگی تھی اور اُس نے قسم کھا کر اپنی ماں سے کہا تھا کہ وہ اُس کی کزن کو کہے کہ منیجر سے بات کر کے اُسے بتا دے کہ وہ نوکر چھوڑ رہی ہے۔ لیکن اُس کی ماں تو یہ سب کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھی۔ اور اب وہ بستر سے اٹھنے کو تیار نہ تھی۔

”گیزو۔ گیزو۔“ ماں نے بیٹی کو جھوٹ موٹ سوتے دیکھا تو بہت بے چین ہوئی۔  
 ”اشوٹرا میں چلنے لگی ہیں۔ تمہیں آٹھ بجے کام پر پہنچ جانا چاہیے۔“  
 دراصل پرلز بل کے سامنے سے گزرنے والی ٹرام کی آواز اُن کی کھڑکی سے سنائی دے جاتی تھی۔ ”اٹھو۔۔۔ اٹھو۔۔۔ تمہیں بہر صورت کام پر جانا ہے۔“  
 ماں نے اپنی بیٹی کو دکھیل کر اٹھانے کی کوشش کی۔  
 لیکن گیزو نے منہ موڑ لیا اور بلا جھجک کہنے لگی: ”تم چاہتی ہو کہ میں ڈھ شرمناک چیزیں فروخت کروں۔ میں تو نہیں کروں گی۔“  
 ”کیوں؟“ ماں نے بیٹی کے کان میں سرگوشی کی۔ ”بیوقوف مت ہو گیزو۔ اماں سے آنے کے بعد ہم اپنی ساری جمع پونجی ختم کر چکے ہیں۔ تم یہ تو جانتی ہو۔  
 تم اپنی ماں کی مدد کیوں نہیں کرتیں؟“  
 ”میں نہیں جاؤں گی۔“

”ذراہ دو بارہ کہنا۔“ ماں ناراض دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے باوجود اُس کی آواز میں نرمی تھی۔ ”تم یہ کیوں کہتی ہو کہ اُن چیزوں کو بیچنا شرمناک ہے۔ ساتھ والے گھر

میں۔۔۔‘ اس نے اپنی آواز اور آہستہ کی، ’شرمناک تو وہ ہے جو یہ ساتھ والی کر رہی ہے۔ لی کی دوسری بیٹی۔ ابھی اسے رقص سیکھے صرف ایک مہینہ ہوا ہے اور یہ تیسرا گاہک ہے جس کے ساتھ وہ بستر میں گئی ہے۔ اُن کی مالی حالت اگرچہ پہلے سے بہتر ہو گئی ہے لیکن پھر بھی شرم کی بات تو ہے۔ تمھاری کہنی تمھیں آٹھ ڈالر ماہانہ تنخواہ دیتی ہے اور اگر تمھارا کام تسلی بخش ہوا تو پانچ فیصد بونس بھی ملے گا۔ یہ کوئی بُری نوکری تو نہیں۔۔۔ گیزو۔۔۔ اپنی ماں کی بات سُنو۔۔۔ جاؤ اور غسل کرو۔۔۔ تمھارا دلہ ابھی تیار ہو جائے گا۔‘

ماں نے بیٹی کو بستر سے گھسیٹ کر نکالا، اُسے کچھ کپڑے دیے اور گھر کے پچھواڑے میں واقع غسل خانے میں دھکیل دیا۔ پھر وہ باورچی خانے میں واپس آئی تاکہ دلہ اپنے کمرے میں لے جاسکے اور اس دوران رقصہ کی ماں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے جو اب باورچی خانے میں اُوگھ رہی تھی کیوں کہ وہ کمرے میں اپنی جگہ اپنی بیٹی اور اُس کے گاہک کو دے آئی تھی۔ سبیلر گل نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر جانے کے لیے کپڑے بدل کر میز پر بیٹھی اور اپنا دلہ کھانے لگی۔ ماں بسٹر وانگ کی کھانسی کی آواز سن کر فکر مند تھی لیکن اُس نے بیٹی کو زور دے کر کہا: ’جلدی کرو۔۔۔ ساڑھے سات بج گئے ہیں۔‘

بیٹی نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ وہ اڑیل ہو گئی تھی۔ ’میں نہیں جاؤں گی۔ میں بالکل نہیں جاؤں گی۔‘ اوہو، پھر وہی رٹ۔‘ ماں نے اپنی چاب سکلکس نیچے رکھ دی۔ وہ غصے میں دکھائی دیتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی پُرسکون بھی تھی ’میں نے تمھیں ہر شے کے بارے میں بتا دیا ہے۔ تم اتنی ضدی کیوں ہو گئی ہو؟ ذرا سانسے والے کمرے میں رہنے والوں کو دیکھو۔ چچا کی دن بھر اپنی سبزیوں کا بوجھ ڈھوتا رہتا ہے اور اُسے صرف دس ڈالر ماہانہ ملتے ہیں۔ اور تمھیں تو روزانہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ دو ایئوں کا بکس اٹھایا اور گلیوں میں بس گھومتے رہے اور مہینے کے آٹھ ڈالر کمالے اور ان کے ساتھ بونس اور الائنس وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ کیا تم چچا کی سے بہت بہتر نہیں ہو؟ اور تو اور بسٹر وانگ، جو نائب خزانچی ہے، مہینے کے صرف دس ڈالر کماتا ہے اور اب وہ بیمار ہے اور اسے بلغم کے ساتھ ٹون آرہا ہے۔ اگر تم ہر ماہ صرف دس ڈالر کی مدد کر دیا کرو تو میں پریشانی سے بچ جاؤں گی تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ تمھیں مجھے اذیت تو نہیں دینا چاہیے۔ پہلے ہی میں کون سا کم فکر مند ہوں۔‘

ماں نے سبزیوں کی ڈش بیٹی کے آگے کی لیکن اس کے ساتھ ہی اُس نے بڑی اشتیاق





کہ یہ حد ذوداثر، انتہائی زبردست اور بڑے کام کی چیز ہے۔ جب وہ چیز تیار نہ ہو تو انھیں بس یہ کرنا ہے کہ تھوڑا سا ”چھوٹا عاشق“ اس پر ملنا ہے۔ باقی کام یہ خود کرے گا۔ پھر وہ جو جی چاہے کر سکتے ہیں۔ چاہیں تو ایک لڑکا پیدا کر لیں۔ یہ سب یاد رہے گا ناں“

نفرت بھری آنکھوں کا بد نظر جوڑا اس پر آگ برسا رہا تھا۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔“ گیز اپنے دل کی دھڑکن کو سن رہی تھی اور اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ شرم سے اُس کے کانوں کی لوہیں بھی تھمتانے لگی تھیں۔

وہ بکس کو زمین پر پھینک دینا چاہتی تھی۔ چیخا چاہتی تھی اور گالیاں دینا چاہتی تھی لیکن اُس نے کُچھ بھی نہیں کیا۔ اس کی بجائے وہ بندر کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے باہر نکل گئی۔

لیکن بندر کی آواز نے اُس کا پیچھا کیا: ”جو کُچھ میں نے بتایا ہے اسے یاد رکھنا۔ دوائی فروخت کرنا بھولنا نہیں۔۔۔۔۔ چھوٹا عاشق۔“

وہ جان بوجھ کر اس کا مذاق اُڑانا چاہتا تھا۔ وہ جواب دے بغیر جلدی سے چلی گئی۔

جلتے سورج کے نیچے گیز وجوم میں اپنا راستہ بناتی رہی۔ اُس کے لیے سنگا پورا اجنبی اور جلتی ہوئی گلیوں کا ایک مجموعہ تھا۔ انسان اور کاریں بھون دینے والی دھوپ میں چرغائے جا رہے تھے۔ باہر سے دیکھا جائے تو وہ جانوروں کا ایک ریوڑ لگتے تھے جن کی شکلیں مسخ ہو چکی تھیں۔ اُنھیں راہ جاتے دوائیاں بیچنے والوں سے نفرت تھی۔

جونہی آپ اُن کے پاس جائیں وہ آپ کو ناقابل برداشت توہین آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یوں بھی گیز و صرف چھ ماہ قبل چین سے آئی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ہمراہ بہت کم باہر نکلتی تھی۔ وہ ان لوگوں سے واقف تھی اور نہ ہی ان کے چال چلن سے۔ وہ اس بات پر برہم تھی کہ آج بھی کل کی طرح ناکام رہے گی۔ جب اُسے بندر شکل کلرک کا خیال آیا تو اُس کی آنکھیں اُس کی شرمابٹ کی تمازت محسوس کرتی دکھائی دیں۔

اگر امانے پر جاپانیوں کا قبضہ نہ ہوتا تو ماں کبھی اُس کے ہمراہ سنگا پور نہ آتی اور نہ ہی اُسے ان شرمناک چیزوں کو فروخت کر کے گزارہ کرنا پڑتا۔ وہ گھر کب لوٹیں گے؟ اِس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ تقریباً اپنا کام بھی بھول گئی۔ اُسے یقین تھا اُس کا وطن وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا اور اُسے اپنے بہن بھائیوں کے چہرے اچھی طرح یاد تھے۔ جونہی وہ کافی شاپ کے سامنے پہنچی وہ سب کے سب فوراً غائب ہو گئے۔

اُسے معلوم تھا عام طور پر اس جگہ حالات کا روبرو کے لئے سازگار ہوتے ہیں۔ وہ کافی شاپ میں ادھر ادھر گھومتی رہی اور اپنے آپ کو کہتی رہی کہ ان کو خاطر میں نہ لاؤ۔ اوولٹین کا ایک ڈبہ پکڑے وہ ایک آدمی کے پاس گئی۔ ”اوولٹین سر؟“ اُس نے کہا۔ اُس آدمی نے اُس کی طرف دیکھے بغیر سر ہلا دیا۔

”اوولٹین؟ گرانپ وائر سر؟“

اُس نے کسی اور کو مخاطب کیا لیکن نہ تو اُن شرمناک چیزوں کا حوالہ دیا اور نہ وہ کُچھ کیا جو دوسری لڑکیاں کرتی تھیں۔ وہ بکس کھول کر اور نمونے باہر نکال کر گا بھوں کو متاثر کرتی تھیں۔ اُس کا خیال تھا اُن لڑکیوں کے برعکس وہ ایک اچھی لڑکی ہے جو اُن جیسی حرکتیں نہیں کر رہی۔ لیکن ایک گاہک نے بھی اُس کی طرف دھیان نہ دیا۔ اُس کے دل میں ایک سیاہ دھبہ اور سرد دھبہ تھا جو لگتا تھا بڑھتا ہی بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جو وہی وہ کافی شاپ سے باہر آئی تپتی ہوئی گئی نے اُس کا استقبال کیا۔ بہت جلد وہ ایک سبزی والے کی دوکان کے سامنے تھی۔ پھر دھات کی اشیاء کی دوکان کے قریب، اور پھر ایک چینی خاندان کے دروازے پر۔ لیکن ہر جگہ اُس کا استقبال سر کے منحنی اشارے سے ہوا جس سے اُس کے دل کا سیاہ دھبہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ کوئی بھی ایسا نہ دکھائی دیا جو اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا روادار ہوتا۔

اب اُس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کام کے اوقات کے خاتمے کا انتظار کرے اور پھر دوایاں بنانے والی دوکان کی طرف لوٹ جائے۔ اُنھیں وہ بکس تھمائے اور پھر گھر جا کر چلاتے اور منٹیں کرتے ہوئے اپنی ماں سے پھر کہے کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے اس کام سے نجات دلوادے۔ پہلے وہ دوپہر اور پھر شام کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن دوپہر سے پہلے ہی اس کی کزن سُوئے اُسے ایک پُر ہجوم گلی کے کونے میں مل گئی۔ سُوئے ہی نے اُسے فارمیسی والوں سے ملوایا تھا۔

”میں کافی دیر سے تمہارا پیچھا کر رہی ہوں۔“ سُوئے شروع ہو گئی۔ ”اس طرح تو چیزیں کبھی فروخت نہ ہوں گی۔ کبھی نہیں۔“ اُس کی کزن نے اُسے ڈانٹ پلائی، جس طرح سکول میں بڑی کلاس کی لڑکی رعب ڈالتی ہے۔ ”تم اپنا بکس کھول کر انھیں چیزیں کیوں نہیں دکھاتی ہو؟ ہو سکتا ہے اس کے اندر کوئی ایسی شے ہو جسے وہ خریدنا چاہیں اور اس سے تمہیں کچھ نفع ہو جائے۔ تم اُنھیں بکس کیوں نہیں دکھاتی ہو؟“

”میں۔۔۔۔“ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے لیکن ایک گرم شرماہٹ نے اُس کی کمر میں پنچے گاڑ دیے۔ ”تمہیں میٹھی میٹھی باتیں کرنا چاہئیں۔ ذرا جان دار بنو تم پینچنے کے قابل بنو گی اور تبھی یہ آس بندھے گی کہ تم کچھ بونس بھی کما لو گی۔ ہو سکتا ہے کہ تم ماہانہ چھ سات ڈالر بطور بونس بنا لو۔ اس میں کیا خرابی ہے؟“

”یقیناً اس میں کوئی حرج نہیں۔“ اس نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ اس میں اپنی کزن کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس طرح چلتے ہوئے وہ سامنے آنے والے ایک شخص سے تقریباً ٹکڑا ہی گئی۔ سوئے دوسری طرف جانے کے لیے مڑ گئی۔ گیزر تیزی سے آگے بڑھ کر اسے جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے مڑی۔ اپنا بکس اس نے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ اپنی کزن سے بیک وقت ڈرتی بھی تھی اور اسے ناپسند بھی کرتی تھی اگرچہ سوئے نے اُس کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ سوئے نے شادی نہیں کی تھی لیکن جب کبھی ”چھوٹا عاشق“ پینچنے کی نوبت آتی تو وہ اجنبیوں کو اس کے تفصیلی فوائد اور استعمال کے طریقے بتانے سے بالکل نہ ہچکچاتی۔ وہ ہر مہینے تین چار ڈالر بطور بونس بھی کمالتی تھی اور گیزر کو اکساتی تھی کہ اس سے سبق سیکھے۔ لیکن وہ کیسے ان شرمناک چیزوں کو فروخت کر سکتی تھی اور بے شرمی کی راہ اختیار کر سکتی تھی۔

”میں اسے کبھی فروخت نہیں کروں گی۔“

اپنی کزن کے دور ہوتے سراپے کی طرف دیکھتے ہوئے یہ احتجاج اُس کے دل کی گہرائیوں میں سے نکلا۔ اس دوران میں وہ ایک کار کے نیچے آتے آتے پئی۔

اب وہ بد دل ہو کر پینے سے شراہور ہو گئی۔ وہ پیچھے ہٹ کر فٹ پاتھ پر آرام کرنے کو تھی کہ پھر سب کچھ بھلا کر دوکانوں اور گھروں میں دوایاں فروخت کرنے کے لیے چل دی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے اپنی کزن کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اپنی عام تقریر کے علاوہ اُس نے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے آپ کو یہ کہتے سنا: ”جناب کیا آپ بچوں کی خوراک خریدنا پسند کریں گے؟ ہمارے ہمسائے کا ایک بچہ ہے جسے یہی خوراک دی جاتی ہے اور وہ بچہ خوب صحت مند اور موٹا تازہ ہے۔“

اسے نہ تو اس نئی تقریر سے فطری مناسبت تھی اور نہ ہی وہ روانی سے بول سکتی تھی اور نہ ہی وہ ابھی ”نفسے عاشق“ کا کوئی حوالہ دینا چاہتی تھی لیکن وہ اپنے ناموجود ہمسائے کا حوالہ دینے چلی جا رہی تھی۔ جب وہ دوکان سے باہر آئی تو بے اختیار ہنسنے لگی کیوں کہ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ



پکڑی بوتل کے ساتھ ایک کھلونے کی طرح کھیل رہا تھا۔ اپنے کان کے پاس لے جا کر وہ اسے ہلاتا تاکہ دوائی کی آواز سن سکے۔ اس کھیل نے تو اسے اور بدحواس کر دیا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس ہاتھ کا کیا کرے جس سے اس نے بس پکڑا ہوا تھا۔ بالآخر اس نے سر اٹھا کر موٹے شخص کی طرف دیکھا جو اب بھی اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ ’جناب آپ تو بہر حال۔۔۔۔۔‘ اس نے اپنے آپ کو کہتے سنا، ’آپ تو یقیناً اسے استعمال کرنا جانتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں نا!‘ یہ سب کچھ اس کے اندر سے ابل پڑا۔ وہ جو بھی کہہ سکتی تھی اس نے کہہ دیا اور اس کے سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی۔

’۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میں تو نہیں جانتا۔‘

وہ شخص بوتل کے ساتھ کھیلتا رہا پھر ایک دم لڑکی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا: ’تم اندر آ جاؤ۔ میں کچھ اور چیزیں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔‘

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دوکان کے عقب میں واقع کمرے میں چلی گئی۔ ’اچھا تو اب مجھے بتاؤ کہ اسے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے‘۔ موٹے شخص نے آواز دہمی کر کے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ اس نے کسی اور شے کو دیکھنے کے لیے بالکل نہیں کہا۔ ’کیسے استعمال کیا جاتا ہے؟ اسے کیسے لگایا جاتا ہے؟‘

’میں۔۔۔۔۔ میں۔‘

جیسے کسی شے نے اسے دکھ دیا ہو۔ اس کا دل منہ کے راستے باہر آنے کو تھا۔ وہ بوکھلا گئی تھی۔ اس نے بوتل کو چھینا مارا اور بس میں رکھ کر آنا فانا دروازے سے باہر نکل گئی۔

’لعنت ہے تم پر۔۔۔۔۔ لنگے۔۔۔۔۔ درندے۔‘

وہ گالیاں دیتے ہوئے چلا رہی تھی اور کمرے میں ایک فلک شگاف تہقہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

وہ غصے سے اُبتی ہوئی گلیوں میں آگئی اور اور ہجوم میں راستہ بنانے لگی۔ وہ اپنی ماں کو یا فارمیسی کے منیجر کو تصور دار بٹھہرانا بھول گئی کہ انھوں نے اس شرمناک چیز کو بیچنے کے لیے زور دیا تھا۔ صرف پیسہ بنانے کے لیے۔ یا اس کی وہ کزن جس نے اسے اس ملازمت کے حصول میں مدد دی تھی۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی چلتی رہی اور کسی کافی شاپ یا کسی اور دوکان کے اندر نہ گئی۔ اسے ایک ناقابل بیان دکھ ہوا، لیکن صرف دکھ۔ ایک ایسی شے کے بارے میں دکھ جو وہ بیان

نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر وہ فارمیسی کے سامنے کھڑی تھی اور اسے اپنی کزن کی آواز کہیں سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ وہ فارمیسی کے اندر چلی گئی۔ اُس لمحے اُسے یوں لگا جیسے اُس نے موٹے شخص کا سایہ دیکھا ہے اور وہ ننگا تھا۔ وہ فارمیسی سے باہر آگئی۔ اُس کی کزن نے اُسے پکارا۔ وہ اُس کا پیچھا کر رہی تھی۔ گیزو نے گلی پار کی اور اس غریب مکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگی جس کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں وہ رہائش پزیر تھی۔ جو نہی وہ کمرے میں داخل ہوئی اُس نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا اور روتے ہوئے کہنے لگی:

”میں کام پر بالکل نہیں جاؤں گی۔ میں اب کام پر نہیں جاؤں گی۔“

”ہو کیا ہے؟ مسئلہ کیا ہے؟“ اُس کی کزن نے بستر پر تھک کر اُس سے بکس لے لیا اور ایک طرف پھینک کر اُسے ہنھوڑا اور جواب دینے کے لیے کہا۔ ماں وانگ کے کمرے میں تھی، وہ بھی جلدی سے باہر آگئی تھی۔ اپنی بیٹی کو یوں روتے دیکھ کر اُس کا دل بہت دکھا۔

”گیزو۔ کیا ہوا؟ گیزو۔“

”تم بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہو۔ سیلز گرل کو کبھی کبھی تکلیف تو ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھا رگالیاں بھی سننا پڑتی ہیں ورنہ یوں تو پھر ہر کوئی سیلز گرل بن جائے۔“ کزن نے گیزو کو جھنجھوڑا، ”رومت۔ میرے سامنے آؤ۔ میں دیکھتی ہوں اس نے تمہاری بے عزتی کی ہے۔“

”میں اس قسم کا کام نہیں چاہتی۔ میں یہ کام نہیں کروں گی۔“

وہ دکھ اور بے چارگی سے روتی رہی۔ اُسے اب بھی وہ موٹا آدمی قہقہے لگاتا دکھائی دیتا تھا۔ ساتھ والا جوڑا ابیدار ہو چکا تھا۔ جب کبھی گیزو کے چلانے کی آواز مدہم ہوتی اُن کے جنسی قہقہوں کی آواز ابھر آتی۔ لیکن جلد ہی قہقہوں کی جگہ سسکیوں اور آہوں نے لے لی۔

چچی کی اور مسز وانگ بھی اپنے کمروں میں رو رہی تھیں کیوں کہ مسز کی کو پولیس نے ٹریفک میں خلل ڈالنے کے الزام میں پکڑ لیا تھا کیوں کہ اُس نے اپنا سامان بیچ بازار میں رکھ دیا تھا اور مسز وانگ نے پھر ٹون تھوکا تھا اور اُس کے مالک نے اسے ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ صرف ٹیکسی گرل کی ماں کو کوئی فکر وفاقہ نہ تھا۔ وہ راہدار یوں میں پھر رہی تھی۔

”یہ مت کہو کہ تم کام نہیں کرو گی۔ مت کہو کہ تم کام نہیں کرنا چاہتیں۔“ ماں نے کہا۔

ساتھ والے کمرے میں گاہک گنگٹار ہا تھا۔ پھر ماں نے روتے ہوئے سرگوشی کی، ”کیا روزی کمانا

آسان ہے؟ اگر تم مشکلات برداشت کرنے کی عادت نہیں ڈالو گی تو پھر کیا ہوگا!“

”ہوا کیا ہے؟ قصہ کیا ہے؟“ سُوئے نے پوچھا۔

گیز واپنی کزن کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس دوران برابر کے کمرے سے ہنسی کی آواز آنے لگی جیسے کوئی کسی کو چھیڑنے پر ٹٹکا ہوا ہو۔

چاہے تمہیں ناگوار لگے پھر بھی تمہیں کام پر جانا پڑے گا۔ ذرا مسٹر وانگ کو دیکھو۔ وہ مہینے بھر سے کام پر نہیں گیا چنانچہ کیا ہوا؟ اگر تم غریب ہو تو پھر کیا کہا جاسکتا ہے؟ اگر تم کام نہیں کر دو گی تو کھاؤ گی کہاں سے،“

ماں نے اس کے آنسو پونچھے اور گری میں ڈھیر ہو گئی۔ مسز وانگ اور چچی کی سسکیوں کی آواز سننے اور اپنی بیٹی کے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے مایوسی اس پر غالب آتی جا رہی تھی۔

”میرے ساتھ آؤ گیزو۔ ساڑھے دس بج چکے ہیں۔“ سُوئے نے کہا۔

”نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔“

”نہیں۔۔۔ تم نہیں جاؤ گی۔“ اُس کی ماں نے دہرایا۔

”بہر حال مجھے تو جانا ہے۔“ کزن نے کہا اور اُن دونوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔

سیڑھیاں اترتے قدموں کی آواز دبی دبی ہنسی۔ دوسرے کمرے سے آہ وزاری کی آوازیں۔

”تم نہیں جاؤ گی۔۔۔۔۔ نہیں جاؤ گی۔۔۔۔۔ تو تم چاہتی ہو کہ ہم بھوکے مر جائیں؟“

ماں سسکیاں بھر رہی تھی۔

برابر کے کمرے سے آنے والا قبچہ پھر سنائی دیا لیکن اس دفعہ وہ بالکل بناوٹی تھا۔

چو چونگ ہی

(کوریا)

## چوم نائے

رات ہے۔ گاؤں اور بالائی گاؤں کے تمام لوگ ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جمع ہیں۔ چاند بھی نہیں ہے۔ جھاڑیاں، پھولوں کی بلیں، مکی کے ٹانڈے اداس ہیں۔ ایک پُر خوف تاریکی ہے جو پانی سے بھرے دھان کے کھیتوں میں منعکس ہوتے تاروں کی وجہ سے کچھ کم ہوتی ہے۔ اور دھان کے کھیتوں کے پانی دروازے کے باہر ایک سمندر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی اس گھر سے تعلق نہیں رکھتا۔

گھر کے صرف تین حصے ہیں۔ ایک آدھا باورچی خانہ، ایک چھوٹا برآمدہ اور ایک کمرہ۔ اس وقت محن اور کمرہ لوگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں اتنے زیادہ لوگ جمع ہیں کہ وہ حرکت نہیں کر سکتے۔ کچھ مرد سیر کرتے ہوئے ادھر اُدھر نکل گئے ہیں اور کچھ دھان کے کھیتوں کے کناروں پر جا بیٹھے ہیں۔ لیکن عورتیں آگے بڑھنا چاہتی ہیں۔ جنھوں نے اپنے بچے پیٹھ پر اٹھا رکھے ہیں وہ ان کی حفاظت کے لیے شور مچا رہی ہیں لیکن وہ پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ ہوا ان کے کپڑوں کی بدبو اور گندے جسموں سے بھاری ہو رہی ہے۔

وہاں ایک بھی ملاقاتی نہ تھا، ایک سٹا تک بھی نہیں، جب کچھلی رات چوم نائے فوت ہوئی بلکہ آج صبح تک بھی کوئی نہیں تھا جب اُس کا باپ اور مگتیر پوگی اُس کا مردہ جسم اٹھا کر لے گئے لیکن آج رات وہ یہاں جمع ہیں تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ شامانی جادو کی رسوں کے ساتھ اُس کی رُوح کو کیسے آزاد کیا جاتا ہے۔ وہ کتنے پتھر دل تھے! ان کا خیال تھا چوم نائے کی موت غیر قدرتی



ہے اس لیے وہ اندھے جوتھی کے ہاں سے اپنی حفاظت کے لیے تعویذ لے کر آئے تھے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی شخص مُردہ لڑکی کی رُوح کے قابو میں آ جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ تو پھر وہ یہ رسم دیکھنے کے لیے کیوں آئے ہوئے تھے؟

انواہ تھی کہ چوم نائے اس لئے مر گئی تھی کہ ایک مرغی کی رُوح اُسے چٹ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اُنھیں معلوم ہوا کہ اُس کی موت کا تعلق ہوسنگ گُو خاندان سے بھی ہے۔ لوگ ان دو حقائق میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُنھیں چوم نائے سے زیادہ دلچسپی نہیں لیکن ہوسنگ گُو اس گاؤں کا امیر ترین آدمیوں میں شمار ہوتا ہے اور اُسے سیول میں بھی جانا پچھانا جاتا ہے۔ اُس شام غریب لوگ اُس کے گھر میں جمع ہو رہے تھے تاکہ ایک امیر آدمی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھ سکیں اور اُس کی تکبریں کریں۔ کبھی کبھار وہ اُسے ایک دیوتا کے طور پر ماننے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر چوم نائے کسی عام بیماری سے مرتی تو لوگ اس طرح جمع نہ ہوتے۔ صرف اُس کے خاندان والے، اُس کا مگیترا اور چند ہمسائے ہی اُس کی آخری رسوم کے لیے آتے۔

جب چوم نائے مری تو لوگوں نے ایک دلہن یا ایک کنواری کی موت کے بارے میں چمگولیاں کیں۔ لیکن نہ تو وہ ایک دلہن تھی اور نہ ہی کنواری۔ وہ ایسی اصطلاحات پر پورا نہیں اُترتی تھی۔

اُس کے والدین نے شدید غربت کی وجہ سے صرف اس لیے، کہ اُن کا ایک بچہ اچھی طرح خوراک حاصل کر سکے، اُس کی مگنی پوگی کے ساتھ کر دی تھی جو منڈی میں ایک شراب فروش کے ہاں ملازم تھا۔ وہ صرف چودہ برس کی تھی۔ چونکہ اُس کی مگنی ہو چکی تھی اس لیے لوگ اُسے دلہن کہتے تھے۔ پوگی کو اس لیے نہیں پُنا گیا تھا کہ وہ بہت امیر تھا، اس لیے بھی نہیں کہ وہ خوش شکل تھا بلکہ صرف اس لیے کہ وہ شراب خانے میں باقاعدہ ملازم تھا۔ اگر وہ اُس کے ساتھ بیانی جائے تو باورچی خانے میں کام کر سکتی ہے اور وہاں اسے کھانا مل سکتا ہے کہ غریب لوگوں کے لیے کھانا بہت اہم ہوتا ہے۔

مگنی کے بعد ان کی شادی اس لیے نہ ہو سکی کہ دلہن کے پاس ایک مناسب لباس ہونا ضروری ہے لیکن اس کے کنبے کے پاس اس لباس کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس کنبے میں نو افراد تھے جن میں دادا، دادی، ماں باپ اور چار چھوٹے بچے شامل تھے۔ خوراک اُن کا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔ لباس کے بارے میں سوچنے کے لیے اُن کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ مگیترا بھی خاندان

کی نسبت زیادہ خوشحال نہ تھا۔ اُس کی ماہانہ تنخواہ خوراک کے علاوہ صرف پانچ سوؤں تھی۔ پانچ سوؤں میں وہ دلہن کے لیے ریان کا ایک سکرٹ اور ایک بلاؤز نہیں خرید سکتا تھا اس لیے اُنھوں نے پانچ ماہ کے لیے شادی کو ملتوی کر دیا تاکہ اس دوران مگنیتر کچھ رقم جمع کر لے۔

پانچ ماہ کے خاتمے پر پوگی اپنی مگنیتر کے گھر گیا اور اُس کے پاس دو ہزار پانچ سوؤں تھے۔ چوم نائے کی ماں نے پوگی سے کہا کہ وہ سیول جا کر لباس کے لیے کپڑا خرید لائے اور وہ خود فوراً جوتھی کے پاس شادی کی تاریخ نکھوانے چلی گئی۔ قمری کینڈر کے چوتھے مہینے کی اٹھائیس تاریخ طے ہو گئی۔ پوگی نے سیول جا کر گلابی ریان اور سوتی کپڑا خریدا۔ سفید کپڑا بلاؤز کے لیے، پاؤڈر کا ڈبہ اور اپنی دلہن کے لیے ایک آئینہ اگرچہ وہ محض ایک کھلونا تھا۔ اپنے لیے اُس نے مقامی جوتوں کا ایک جوڑا خریدا جو ہڈانے ٹارڈوں سے بنا ہوا تھا اور ایک جوڑا جرابیں۔ اس خریداری میں اُس کی کل پونجی خرچ ہو گئی۔ جب وہ دلہن کے گھر آیا تو ماں اور دادی نے آئینے کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ اُسے دلہن کی جرابوں کے لیے سوتی کپڑا بھی خریدنا چاہیے تھا۔ پوگی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور سر ہلایا۔ بالآخر اُس نے اُنھیں بتایا کہ اُس کی خالہ نے اُسے دو چوزے شادی کے تحفے کے طور پر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ تب وہ پہاڑی کے پار گیا، چوزے حاصل کیے اور اُنھیں چوم نائے کے گھر لے گیا۔ جب یہ بڑے ہو جائیں گے تو دلہن کی جرابوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا!

لیکن شادی کے منصوبوں میں ایک اور اڑجن آ پڑی۔ تاریخوں کا مسئلہ۔ قمری سال کے چوتھے مہینے اٹھائیس تاریخ کو 16 جون تھی جس دن سن ہانگ کی شادی ہو رہی تھی جو ہوسنگ ٹو کی بیٹی تھی۔ یہ تاریخ گزشتہ نومبر میں طے پائی تھی اور ہر کوئی جانتا تھا کہ ایسا ہوا ہے لیکن چوم نائے کے کنبے کو احساس نہ ہوا کہ دونوں تاریخیں ایک ہیں۔ 16 جون سے صرف دس روز پہلے، جب ہو گھرانے والے اپنے رشتے داروں اور اپنے مزارعوں سے مل رہے تھے، صرف اُس وقت چوم نائے کے کنبے کو پتا چلا۔ دوسروں کے لیے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن چوم نائے کے کنبے کے لیے، جو پُخت ہا پُخت سے ہو گھرانے کے مزارع چلے آ رہے تھے یہ ایک سنجیدہ مسئلہ تھا۔ اُنھوں نے مسٹر ہو کو اپنی بیٹی کی مگنی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ہو خاندان یقیناً اُس چیز کو ناپسند کرتا کیونکہ چوم نائے اکثر اُن کا کام کیا کرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ لڑکی کے والدین اس لیے بھی شرمندہ تھے کہ لڑکی کی عمر شادی کے لیے ابھی بہت چھوٹی تھی۔ چنانچہ چوم نائے کے گھر

والوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اعلان کر دیں کہ اُن کی بیٹی کی شادی اسی تاریخ کو ہو رہی ہے جس تاریخ کو اُن کے زمیندار کی بیٹی کی شادی طے پائی ہے۔

مایوس ہو کر چوم نائے کی ماں جوتشی کے پاس گئی تاکہ اُسے پوری صورت حال بتا کر کوئی نئی تاریخ نکلا سکے۔ ہو سکے تو اس سے بھی پہلے! لیکن نایب نے جوتشی نے سر ہلا کر بتایا کہ ساتویں مہینے کی پندرہویں تاریخ سے پہلے کوئی تاریخ مناسب نہیں۔ اس سے پہلے کی کوئی بھی تاریخ جوڑے کے لیے مبارک ثابت نہیں ہوگی۔ اُن میں سے کسی ایک کی ناگہ بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ چنانچہ وہ ساتویں مہینے کی پندرہویں تاریخ پر راضی ہو گئے۔

چوم نائے نے یہ خبر سُن کر سکھ کا سانس لیا کہ شادی تین ماہ بعد ہوگی۔ یہ نہیں کہ وہ شادی کروانے میں لیٹ و لعل کر رہی تھی بلکہ اُسے معلوم تھا کہ اتنے عرصے میں پُورے اتنے بڑے بڑے ہو جائیں گے کہ ادوہ اُنھیں فروخت کر کے جرابوں کی بجائے کوٹ کا کپڑا خرید سکے گی۔ اُسے اپنی سبیلی سونی یاد تھی۔ شادی کے بعد وہ ایک نفیس کوٹ میں ملبوس تھی اور اُس کا چہرہ کریم سے گورا ہو رہا تھا۔ چوم نائے اُس کی نقل کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بہر حال اتنی احمق نہیں تھی کہ ہو کی بیٹی کی فضول خرچیوں کی نقل اُتارے۔ اُس نے اُس امیر لڑکی کے ساتھ کبھی بھی اپنا مقابلہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی اپنی غربت کا رونا روتا تھا۔ اُس کے ذہن میں غیر مساوی معاشرے کا کوئی تحلیل نہ تھا اس لیے وہ اس حقیقت کو قبول کرتی تھی کہ کچھ لوگ امیر ہوتے ہیں اور کچھ غریب۔ صرف چوم نائے ہی نہیں بلکہ اس طبقے کے بیشتر لوگ اس صورت حال کو قبول کرتے تھے اور اس قسم کی غلامانہ ذہنیت نے صرف ایک دو دن میں یادس بیس برس میں جنم نہیں لیا تھا بلکہ پشت ہاپشت کی غلامی نے اُن کو ایسا کر دیا تھا۔

ہو کی کی بیٹی کی شادی بہت شاندار تھی اور ضیافت انتہائی پُر تکلف۔ بے شمار لوگ کھانے اور خاص طور پر پینے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ کچھ کا خیال تھا کہ کم از کم دس ہزار افراد شامل ہوئے تھے اور کئی تو ایک لاکھ کے قریب قریب بتاتے تھے۔ چونکہ ہو کی صرف ایک ہی بیٹی تھی اس لیے اُس نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ مہمان صرف آس پاس کے گاؤں سے ہی نہیں بلکہ سیول تک سے آئے۔ ان میں اعلیٰ حکام کے علاوہ امریکی معززین بھی شامل تھے۔

اس شاندار تقریب کے کئی روز بعد ہو کی بیٹی، داماد اور دیگر عزیز واقارب سیول روانہ ہوئے۔ اُن کے ساتھ وہ تحائف اور دولت تھی جو ڈولھن ساتھ لے کر آئی تھی۔

تین دن بعد چوم نائے کا ایک چوزہ ہو کے گھر ترکاریوں کی کھیتی میں چلا گیا اور اسے مسٹر ہونے پکڑ لیا۔ ہو جانوروں اور مزارعوں کے ساتھ بالعموم اچھا سلوک نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ چوزے کے ساتھ باقاعدہ ظلم پر اتر آیا۔ بیٹی کی شادی کے شور شرابے کے بعد وہ اب ذرا اٹھھا ہوا تھا یا شاید اسے اتنی زیادہ دولت لٹا دینے کا ڈکھ ہو رہا تھا یا شاید اسے اپنی اکلوتی بیٹی کے کسی اور کے پاس چلے جانے کا غم تھا، جواز جو بھی ہو وہ بے حد غصے میں تھا۔ اس نے چوزے کے پر باندھ کر اسے ایک لمبے بانس کے سرے پر باندھ دیا اور بانس کو پاؤں میں کھڑا کر دیا۔ عام طور پر وہ آوارہ مرغیوں کو پتھروں سے ہلاک کر دیا کرتا تھا یا ان کی ٹانگیں توڑ دیا کرتا تھا۔ چونکہ ہو کا گھر بہت بڑا تھا اور اس کا باغ بہت چوڑا تھا اس لیے مزارعوں کے چھوٹے چھوٹے گھروں نے اس کے گھر کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور ان کی مرغیاں وغیرہ اکثر باڑ پر سے اڑ کر اس کے باغ میں جا کر خوراک تلاش کرتی رہتی تھیں۔ چنانچہ ہونے اپنے مزارعوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ مرغیاں نہ پالا کریں حالانکہ پورے ملک میں رواج تھا کہ مرغیاں کھیتوں اور باغوں میں آزادانہ آجاسکتی ہیں۔ مرغیوں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ کچھ مرغیاں کھائے گئے، کچھ فروخت ہوئے اور کچھ ہو کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔ چنانچہ پورے گاؤں میں چوم نائے کے علاوہ کسی کی مرغیاں باقی نہ رہیں۔ ظاہر ہے چوم نائے اور اس کا خاندان مرغیوں کو آزادانہ نہیں گھومنے دیتا تھا۔ پہلے پہل انھوں نے ان کو ایک رسی سے باندھے رکھا، پھر چار دیواری کے اندر بند رکھا لیکن اس روز جب انھیں پانی ڈالنے کے لیے دروازہ کھولا گیا ان میں سے ایک چوری چھپے باہر آگئی اور کسی نہ کسی طرح ہو کے باغ میں پہنچ گئی۔

مرغی آسمان میں اٹکی چیخ رہی تھی اور ہو غصے میں بکتا جا رہا تھا: یہ کس کا چوزہ ہے؟ کیا یہ چوم نائے کے باپ تائے چون کا ہے؟ وہ مرغیاں پالتا ہے اور انھیں آزادانہ گھومنے دیتا ہے۔ لوگ تو بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے بھی بد تمیزی سے بولتے ہیں۔ وہ بھول گئے ہیں کہ وہ کس کے کرم کی وجہ سے زندہ ہیں۔ پشت ہانپشت سے وہ میرے خاندان کی دولت پر پلٹے آئے ہیں۔ اب وہ مساوات کی بات کرتے ہیں۔ یہ تائے چون بھی ایسے ہی بدتمیزوں میں سے ایک ہے۔ مرغیاں پالتا ہے اور میری سبزیاں خراب کرتا ہے۔ (اسے ایک نوکرانی نے بتایا تھا کہ مرغی تائے چون کی ہے۔) چوم نائے اور اس کا خاندان جانتا تھا کہ ہونے ان کی مرغی پکڑ لی ہے لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس کی واپسی کا

تقاضا کر سکتے۔ اُن کے پاس خوفزدہ ہونے کی ایک خاص وجہ تھی۔ آزادی کے بعد امریکی فوجی حکومت نے مزارعوں کے قانون میں تبدیلی کر دی تھی۔ اب اُنھیں نصف کی بجائے فصل کا تیسرا حصہ زمیندار کو دینا پڑتا تھا۔ اگرچہ یہ تبدیلی مزارعوں کی بہتری کے لیے کی گئی تھی لیکن اس سے مزید چھپیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ زمینداروں نے اُن زمینوں کو فروخت کرنا شروع کر دیا جو زیادہ منافع بخش نہیں تھیں۔ بُو بھی اُن لوگوں میں شامل تھا جو دور افتادہ اور کم منافع دینے والے زمین کے ٹکڑے بیچنے کے بارے میں منصوبے بنا رہے تھے۔ ذہ چاہتا تھا اُس کے مزارعے ہی زمینیں خرید لیں لیکن اُن کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا چنانچہ جس کے پاس بھی رقم ہو وہ یہ زمین خرید سکتا تھا۔ چوم نائے کا خاندان اس منصوبے کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس کا باپ اپنے چھوٹے سے گھر کے سامنے والے ٹکڑے پر کاشتکاری کرتا تھا اور یہ ٹکڑا بُو کی ملکیت تھا۔ اُس نے زمین بیچنے کا اعلان کر دیا لیکن تائی چون اتنا غریب تھا کہ وہ اُس کا ایک حصہ بھی خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ بُو اِس زمین کو کسی اور کے ہاتھ بیچنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نیا زمیندار تو اپنے پسندیدہ مزارعوں کو زمین ٹھیکے پر دے گا اور بُو کبھی بھی تائے چون کی سفارش نہیں کرے گا۔ اس وجہ سے تائے چون کا خاندان بُو سے ڈرتا تھا۔

اِس سدھارے گئے مزارعہ سسٹم کے بارے میں بہت ساری کہانیاں تھیں۔ مزارعوں نے اپنے کنبوں کو بھوک سے بچانے کے بارے میں بہت سوچ بچار کیا اور اُن میں سے کچھ جو ذرا تیز تھے اُنھوں نے اپنے گھر، گھروں کا سامان اور جانور فروخت کر کے بھی زمین خریدنے کی کوشش کی۔ جب اُنھیں معلوم ہوا کہ اب بھی اُن کے پاس پوری رقم نہیں ہے تو وہ سودخوروں کے پاس گئے تاکہ وہ زمین، جو اُنھوں نے ابھی خریدنا تھی، اُسے گروی رکھ کر کچھ رقم حاصل کر سکیں۔ ایسے قرضوں پر ماہانہ دس فیصد سے زیادہ سود ہوتا تھا لیکن لاپٹی سود خور سود کی بجائے گروی رکھنے کے نئے نظام میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اِس نئے نظام کے تحت وہ ہر سال فصل کا نصف حصہ حاصل کر سکتے تھے اور یوں اس کے نتیجے میں وہ ’’آدھی فصل مالک کی اور آدھی مزارعے کی‘‘ سے زیادہ گھائے میں رہتے۔ بہر حال نیا نظام رائج ہو چکا ہے اور غریب مزارعین کو تو ہر صورت کھانے اور رہائش کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہے چنانچہ وہ ہر ممکن کوشش کر دیکھتے ہیں۔ یوں زمین خرید لینا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہاں تو ایسے سود خور بھی کم تھے جو رقم ہی ادھار دے سکتے۔ چنانچہ اس نظام سے نہ زمیندار خوش ہوتا ہے اور نہ ہی مزارعے کی تسلی ہوتی ہے۔

چوم نائے کا خاندان غریبوں میں سے بھی غریب ترین تھا اس لیے زمین خریدنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس دوران ہُو کچھ اور غصیلا ہو گیا۔ صرف اس کے لیے نہیں کہ اُس کی بیٹی کی شادی ہو گئی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ کیونز م کے پھیلنے کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ ایک ایسا نظام جو زمیندار کے لیے امریکی جمہوریت سے بھی بدتر تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے سے پوچھا، جو فوجی حکومت میں کام کر رہا تھا، کہ جمہوریت اور کیونز م میں سے کون جیتے گا؟ اُس کے بیٹے نے جواب دیا کہ جب تک درمیانی مدت کی کوریائی حکومت نہیں بن جاتی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُسے پُرانے نظام کی بحالی کے بارے میں زیادہ اُمید نہ تھی اور جمہوریت اور کیونز م میں سے اُسے کوئی بھی پسند نہ تھا۔ ہُو اسی وجہ سے بے چین تھا۔ چوم نائے کی مرغی اور خود چوم نائے اُس کے لیے بے چینی کی ایک وجہ بن گئے۔

گاؤں کے لوگوں کا کہنا تھا کہ چوم نائے اس لیے مر گئی کہ اُس پر مرغی کی رُوح قابض ہو گئی تھی۔ ان پڑھ لوگوں کے لیے اسی قسم کے توہمات پر یقین کر لینا بالکل قدرتی ہوا ہے۔ لیکن اُس کی موت کے حقائق سراسر مختلف تھے۔ دو دن تک چوم نائے اپنی مرغی کو آسمان میں لٹکے اور چلاتے دیکھ کر بے حداذیت محسوس کرتی رہی۔ تیسری رات آئی تو وہ یہ اذیت برداشت نہ کر سکتی۔ جب سفید بادلوں میں سے چاند چمکنے لگا وہ چمکنے سے گھر سے نکلی اور مرغی کی طرف دیکھا۔ مرغی پھر چلانے لگی۔ وہ چوری چھپے پھاٹک کے راستے ہُو کے باغ میں داخل ہوئی۔ بانس کو اتارا اور رسیاں کھول کر اپنی مرغی لے آئی۔ جونہی وہ پھاٹک کے راستے بھاگ کر جانے لگی گھر کے اندر سے ایک کھر دردی آواز سنائی دی۔ وہ بہت تیز بھاگ رہی تھی اس لیے گر گئی۔ پھر اُسے ایک پتھر آگیا جو مسڑ ہونے سے مارا تھا۔ بہر حال وہ پھر اٹھی اور ہُو سے خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگی۔ جب وہ اپنے گھر پہنچی تو دروازے کے قریب بے ہوش کر گئی۔ اُس کے والدین باہر آئے اور اُنھوں نے دیکھا اُس کے ماتھے پر ایک زخم تھا جس میں سے خُون بڑی طرح بہ رہا تھا۔ اس کے باوجود مرغی اُس کے ہاتھوں میں تھی جو تقریباً ادھ موٹی ہو چکی تھی۔ اُس کے والدین نے اُس کے زخم پر سویا بین کی کریم لگائی۔ اُن کا خیال تھا یہ ایک معمولی چوٹ ہے جو باڑ میں گزرتے ہوئے کسی ٹہنی کے لگ جانے کی وجہ سے آئی ہے لیکن زخم کو مندل کرنے کی بجائے سویا بین کریم نے اسے خراب کر دیا۔

اُنھوں نے مرغی کو لپھ چاول ڈالے جو وہ نہ کھاسکی اور چند گھنٹوں کے بعد ایک آخری



گرنی ایک امیر آدمی کی طرفداری کرتی ہے۔ (پیارے ماں اور باپ مہربانی فرما کر دوسری مرغی سے بھی نجات حاصل کر لیں۔) اس موقع پر نائب ایک چھڑی ہلاتا کھڑا ہوتا ہے اور مرغی کو تلاش کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ خوفزدہ لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ چوم نائے کے ماں باپ جادو گرنی سے وعدہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یعنی چوم نائے کی رُوح سے۔۔۔۔۔ کہ وہ اُس مرغی سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔

اس دوران دادا اور دادی خاموش بیٹھے رہتے ہیں، جیسے بُت ہوں۔ اس وعدے پر نائب کمرے میں واپس آ جاتا ہے اور اپنی نشست پر بیٹھ جاتا ہے۔ رُوح پھر جادو گرنی کے مُنہ سے بولتی ہے:

”پیارے ماں، جتنی بھی چیزیں تم نے میرے مستقبل کے استعمال کے لیے تیار کی تھیں انہیں لوگوں میں بانٹ دو۔ وہ میرے لیے فضول ہیں۔“ نائب پھر اپنی لہراتی ہوئی چھڑی کے ساتھ اُٹھتا ہے اور اب وہ بھی رُوح کے اثر سے کچھ کپکپا رہا ہے۔ وہ کپڑوں کو تلاش کرتا ہے۔ چوم نائے کی ماں سبکیاں لیتی ہے۔ ”میری پیاری بیٹی تم فکر نہ کرو میں مرغی سے پیچھا چھڑالوں گی۔ تم سکون سے اپنے راستے پر جاؤ اور فکر نہ کرو۔“

نائب چوم نائے کی ذاتی اشیاء ڈھونڈتا رہتا ہے اور بالآخر اُس کی ماں شلیف پر سے ایک ڈبہ اُتار کر اُسے دے دیتی ہے۔ وہ اُسے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور چھڑی کی مدد سے کھولتا ہے اور اُس میں رکھی چیزیں نکال لیتا ہے۔ کچھ زیادہ چیزیں نہیں ہیں۔ ایک گلابی بلاؤ ز اور ایک سکرٹ۔ بس یہی سب کچھ تھا۔ جادو گرنی بے حد مایوس ہوتی ہے۔ اگرچہ خاندان بہت غریب تھا لیکن پھر بھی اُس کا خیال تھا کہ اس سے تو کہیں زیادہ سامان ہوگا۔ رواج یہی تھا کہ ایسی اشیاء کو جادو گرنی کو دے دی جاتی تھیں کیونکہ یہی تو اُن کا کاروبار تھا۔ جب قیمتی چیزیں برآمد ہوں تو جادو گرنی مسرت کی انتہا نہیں رہتی اور وہ عمل جاری رکھتی ہے لیکن یہاں مایوس ہو کر وہ عمل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے اور پھر ایک آخری فقرہ سامنے آتا ہے:

”خدا حافظ ماں، باپ، دادا، دادی۔ خدا حافظ میری بہنو اور خدا حافظ میرے پیارے خاوند۔ اگرچہ تمہارے بازو میرے نصیب میں نہ تھے لیکن میرا دل ہمیشہ تمہارے لیے تھا۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔۔۔ میں ایک نامعلوم منزل کی طرف جا رہی ہوں۔“

چوم نائے کی ماں صحن میں چلی جاتی ہے۔ وعدہ کے مطابق مرغی کچڑتی ہے اور جادو



گرنی کے پاس لے جاتی ہے۔ شادی کے کپڑے تہہ کر کے اُس کے سامنے رکھ دیے جاتے ہیں۔ اُس صبح جب اُس کا منگیتر چوم نائے کا مردہ جسم اٹھا کر لے گیا کچھ لوگوں کا خیال تھا اُن چیخوڑوں کی بجائے، جو اُس کے جسم سے لٹک رہے تھے، اُسے شادی کا جوڑا پہنانا چاہیے لیکن اُس کے خاندان کو ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ نئے کپڑے تو جادو گرنی کے عمل کا معاوضہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے یہ رسم تدفین کے بعد از حد ضروری ہے۔ ان کو یقین تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے کیونکہ یہ ایک دلہن کی موت تھی۔

اس کے بعد جادو گرنی اُس جگہ کو دیکھتی ہے جہاں مردہ جسم پڑا ہوا تھا اور اب سفید چاول بکھرے ہوئے تھے اور پھر خاندان کو بتاتی ہے کہ چوم نائے ایک بھول میں تبدیل ہو چکی ہے جس کی شکل وہ چاولوں میں دیکھ سکتی ہے۔ نائے چاولوں کو ایک چھوٹے سے تھیلے میں ڈال لیتا ہے۔ اب نائے اور جادو گرنی کے پاس وہ ساری چیزیں موجود ہیں جو کچھ قیمت رکھتی ہیں اور وہ رخصت ہوتے ہیں۔ ہجوم تو کب کا جا چکا ہے۔ صرف خاندان کے افراد کے بغیر کسی تاثر کے بُت بنے بیٹھے ہیں جیسے اُن پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

ہمسایوں میں سے کوئی بھی چوم نائے کی موت کا سبب نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اُنہوں نے جاننے کی کوشش کی۔ وہ مطمئن ہیں کہ مرغی کی رُوح چوم نائے میں حلول کر گئی تھی اور یہی اس کی موت کا سبب بن گیا۔

یون سی  
(کوریا)

## مسزسن کی موت

جس وقت مسزسن سوز و گل کی طرف گئے ان کی بیوی یون سی کڑھائی کے کام میں مشغول تھی۔ اگرچہ اس کے ہاتھ سینے پر ونے میں مصروف تھے لیکن اس کا دماغ مختلف چیزوں کے بارے میں پریشانی کے عالم میں چکرار ہاتا۔ بچھلی شب اس کا خاوند دیر سے گھر آیا تھا اور پھر نشے کی حالت میں اس نے عجیب و غریب طریقے سے آہ بھری تھی اور جس طرح اس صبح اس کا خاوند اس سے کوئی بات کیے بغیر گل کی طرف چلا گیا، جیسے کوئی مرنے جا رہا ہو، مایوسی کی حالت میں۔۔۔۔۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی وجہ سے اسے تشویش تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی بہت ہی خوفناک واقعہ ہونے کو ہے۔ اس کے خیال میں ان دنوں حکومت میں جو ہیبت ناک واقعہ ہوا تھا اس کے نتیجے میں اس کے خاوند پر بھی کوئی مصیبت آنے والی تھی۔

موت! جیسا کہ اس نے بچھلی شب سوچا تھا۔ آثار تو یہی تھے کہ اس کے خاوند کی قسمت میں موت ہی لکھی ہے۔ اس نے اپنی موت کے بارے میں بھی سوچا اور اپنے بیٹوں کی موت کے بارے میں بھی۔ جن کا شاہی خاندان پر انحصار تھا اور اس کے بعد جو کچھ بھی پیش آئے گا۔ کڑھائی کا کام کرتے ہوئے جب اس قسم کے خیالات اس کے ذہن کو پریشان کر رہے تھے تو اس کی ملازمہ یا مہون بھاگی ہوئی گھر میں آئی اور اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ اپنی مالکن کو آواز دی۔

یون سی نے جب یا مہون کو اس طرح گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ دہل گئی۔ خاوند کی موت کا خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا۔ اس نے کڑھائی کا کام فوراً بند کر دیا اور اٹھ کر کہنے لگی: ”کیا ہوا؟ کیا ہوا؟“ وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر گئی جہاں یا مہون کی

سانس ابھی تک ٹھیک سے نہیں چل رہی تھی۔

’جب میں گلی میں گئی ہوں تو وہاں خاصے لوگ جمع تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ انھوں نے مجھے بتایا کہ دو دوزیروں، ساگ اور باگ نے، غیر قانونی طور پر بادشاہ بن بیٹھے والے کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ ان کا منصوبہ ظاہر ہو گیا اور اب بادشاہ خود انھیں سزا دے گا اور انھیں آج سنا منولے جا کر پھانسی دے دی جائے گی۔‘

یامون اپنی داستان بڑی مشکل سے سانسکی۔ جونہی یون سی نے یہ سب کچھ سنا تو اس کو ذہنی طور پر شدید دھچکا لگا اور اس کے اعصاب کچھاڑ کا شکار ہو گئے۔

بالآخر یامون کی سانس درست ہوئی اور اس نے یون سی سے پوچھا۔ ’’مادام‘‘ ویسے یہ جو وزیر تھا ساگ، یہ وہی تو نہیں تھا جو اس گھر میں آیا کرتا تھا اور ہمارے وزیر مسٹرن کے بے حد قریب تھا؟‘‘

یون سی نے اثبات میں یوں سر ہلایا جیسے اسے جواب دینے کی کوئی پروا نہ ہو۔ یامون چونکہ بہت پریشان تھی اس لیے اس نے پھر پوچھا: ’’لیکن تمہارے خاوند کا تو اس بھگڑے سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔۔ یا ہے؟‘‘

یون سی نے اپنے دماغ میں ہی سوچا کہ ہاں شاید وہ ان کے ساتھ شریک ہو لیکن وہ یہ بات بلند آواز سے تو نہیں کہہ سکتی تھی اس لیے خاموش بیٹھی رہی۔

اس نے سوچا ’’کل اس کا رویہ بے حد مشکوک تھا اور اس کا مطلب تو یہی ہوگا۔۔۔‘‘ اسے محسوس ہوا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہے۔ اسے اپنے خاوند کی موت کے سوا کوئی اور انجام نظر نہیں آ رہا تھا اور اپنے لیے بھی اسے موت ہی نظر آتی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے شاہی خاندان پر انحصار کرنے والے۔ اس کا جی جل گیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اس سارے قضیے کے بارے میں غور کیا۔ موت اور زندگی۔۔۔ زندگی اور موت۔۔۔۔۔ وہ بڑبڑاتی رہی اور اکیلی بیٹھی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی اس کے نوجوان بیٹوں کو گرفتار کر لیں گے اور انھیں مار ڈالیں گے، اور اسے اس دربار میں ملازمہ بنالیں گے۔ اس نے اس کے بارے میں کچھ زیادہ سوچا۔ خاوند اور بیٹوں کی موت کے بعد ایک ملازمہ کی حیثیت سے زندہ رہنا کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوگا۔ اس کے ذہن نے دہائی دی۔

’’موت سے بہتر کوئی شے نہیں۔‘‘ بے عزتی کی طویل زندگی سے موت بہتر ہے۔

اس کا جی جل رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ سردی سے کانپ رہی تھی جیسے اس کے کمرے میں تیز سرد ہوا چل رہی ہے۔

خاصی دیر بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ اس نے سوچا: جو شخص اعلیٰ اقدار کا مالک ہو وہ فاداری اور پاکیزگی اس کے فرائض میں شامل ہونی چاہیے۔ اور سب سے ایماندار شخص کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ وہ مرجانا چاہتی تھی اور اس کے ذہن نے اس بات کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس نے اس بارے میں غور کیا کہ جب وقت آئے گا تو وہ کس طرح اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے گی۔ وہ ایک خنجر اپنے سینے میں بھونک لے گی یا اپنے آپ کو کسی گہرے کنوئیں میں گرا دے گی۔

اس نے دیوار کے ساتھ ایک سفید تولیہ لٹکتا ہوا دیکھا اور اسے خیال آیا کہ وہ اپنے آپ کو لٹکا کر بھی تو مار سکتی ہے۔ یونسی نے اپنے گھر والوں کو گلی میں بھیج دیا۔ اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ دیکھ کر بتائیں کہ کیا اس کا خاندان بھی ان لوگوں میں شامل ہے۔ جنہیں گرفتار کیا گیا ہے اور اگر ہے تو فوراً واپس آ کر اطلاع کریں۔

اب جب کہ اس نے موت کے بارے میں فیصلہ کر لیا تھا۔ یونسی کا داغ پُر سکون تھا۔ اس کا دل موت کو قبول کر چکا تھا اور وہ بھی سکون سے تھا۔ وہ ایک سرد نیلے چاند کی طرح تھی جو باوجود یکہ سیاہ بدلیوں میں گہرا ہوتا ہے اور وحشی ہوا میں اور خوفناک بارشیں اس پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ وہ اپنی زرد کرنیں بڑے سکون سے دنیا پر پٹھا ڈر کر تارہتا ہے۔

یونسی نے سب سے زیادہ صاف ستھرا سوتی تولیہ دیوار سے اتارا اور گھر کی سب سے اوپر والی منزل پر چلی گئی۔ اس نے تولیے کو دو حصوں میں لپیٹا اور موٹے شہتیر کے ساتھ لٹکا دیا۔ یونسی نے اپنی موت کی پوری تیاری کر لی۔ سوتی تولیے کو پکڑنے کے لیے وہ اپنی ایڑیوں کے بل کھڑی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ دیکھنے کی بھی کوشش کی کہ باہر گلی میں کیا ہو رہا ہے لیکن یہاں سے صرف ہمسایوں کی چھتیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے گلی میں سے بلند ہوتی آوازوں کو سننے کی کوشش کی لیکن وہ کسی ایک آواز کو بھی پہچاننے میں ناکام رہی۔ وہ صرف ہوا کے ساتھ آنے والے شور کو سن سکتی تھی۔

ملازمین، جنہیں گھر سے باہر بھیجا گیا تھا، واپس آئے اور انہوں نے تفصیل بتائی۔

”وزیر ساگ اور وزیر باگ کی گھیاں ابھی ابھی گزری ہیں۔“

جب یون سی نے یہ سنا تو اسے یقین ہو گیا کہ اگلی بکھی اس کے خاوند کی ہوگی۔ اس نے کچھ کہے بغیر سر ہلایا اور ملازموں کو دوبارہ گلی میں بھیج دیا تاکہ وہ وہاں کی خبر رکھ سکیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم واپس آیا اور یون سی نے اس سے پوچھا کہ اب کون آیا ہے؟

”وزیر ایلا اور شاہی استاد کی بگھیاں ابھی ابھی گزری ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

یون سی نے اسے دوبارہ گلی میں بھیج دیا۔

ملازم ایک متر بہ پھر واپس آیا۔ بڑے ساگ صاحب یعنی وزیر ساگ کے والد صاحب کی بکھی بھی گزری ہے۔

یون سی حیران تھی کہ آخر اس کے خاوند کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ملازم کو گلی میں بھیجا اور اسے یقین تھا کہ اب اس کے خاوند کی بکھی ضرور گزرے گی۔

تھوڑی دیر بعد ملازم پھر واپس آیا اور کہنے لگا۔ ”جنرل یون کی بکھی ابھی گزری ہے۔“

یون سی نے بے چینی محسوس کی اور اسے خیال آیا کہ شاید اس کا خاوند محل میں ہی مارا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ملازموں کو بالکل ٹھیک ٹھیک معلومات حاصل کرنے کے لیے خبردار رہنے کا حکم دیا۔

اس دوران شام ہو گئی اور پر شور گلی آہستہ آہستہ خاموش ہو گئی۔

شام کے وقت ملازم واپس آئے اور انھوں نے بتایا کہ شاہی دربار سے وابستہ تمام افراد بگھیوں میں لے جائے گئے ہیں اور گلی میں جمع شدہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا ”ہم نے سوچا شاید ہم غلطی پر ہیں۔ چنانچہ ہم نے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھا کہ وہاں سے گزرنے والی بگھیوں کی کل تعداد کتنی ہے۔ انھوں نے بھی اتنی ہی بتائیں جتنی ہم نے گئی تھیں۔“

یون سی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا یقیناً اس کا خاوند محل ہی میں مارا گیا ہے۔ وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اذیت سہتے اور مرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کے خاوند کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا جس کے بال کھلے ہوئے اور پریشان تھے اور ان پر خون لگا ہوا، جو اپنے اعضاء کو آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا حتیٰ کہ اس کا دل ٹوٹ گیا اور سانس رک گئی۔ اس نے چند ملازموں کو ہر ممکن تفصیل حاصل کرنے کے لیے محل کی طرف دوڑایا۔

جب وہ بیٹھی انہی مصیبتوں کے بارے میں غور کر رہی تھی تو اس نے ایک دم گلی میں کچھ شور سنا۔ کوئی چیخ رہا تھا کہ اعلیٰ حکام کے لیے راستہ دو۔

’ہنگ ہو۔ ہنگ ہو۔‘

’اوائے پیچھے ہٹ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔‘

’وہاں کھڑے ہو جاؤ۔‘

’ادھر بیٹھ جاؤ۔‘

’خاموش‘

’اوائے تم وہاں کھڑے ہو جاؤ اور وہاں بیٹھ جاؤ۔‘

’خاموش‘

’ہنگ ہو۔ ہنگ ہو۔‘

’جو ملازم باہر کھڑا تھا بھاگتا ہوا اندر آیا اور چیخ کر بولا:

’مادام، مالک تشریف لارہے ہیں۔‘

یون سی اپنے خاوند کی واپسی کا سن کر بے حد حیران ہوئی جو اب بھی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ محل میں مارا گیا ہے۔ وہ ایک لمحے میں جان گئی کہ یقیناً اس نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ وہ تو مرنے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اب اس کے اندر اپنے خاوند کی اس کمزوری نے اداس کر دیا۔ اس کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ صرف اس کا خاوند زندہ ہے اور واپس گھر آیا ہے جب کہ اس کے تمام دوست گرفتار کر کے پھانسی چڑھانے کے لیے لے جائے جا چکے ہیں۔ اس کا چہرہ بیلا بڑ گیا اور وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش میں مفلوج ہو کر رہ گئی۔

عین اس لمحے درمیانے پھانک کا اندرونی دروازہ ایک پر شور طریقے سے کھلا اور

سنگ زو اندر آ گیا۔

یون سی بے حس و حرکت اسی مقام پر بت بنی کھڑی رہی جہاں وہ سارا دن کھڑی رہی تھی اور سامنے گھورتی رہی۔ جب سنگ زو ٹھکا ہوا چوکھٹ کے قریب پہنچا۔ وہ کہنے لگی: ’تم واپس کیوں آ گئے ہو! مرے کیوں نہیں؟‘

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ سر جھکا کر بڑ بڑایا۔ ’اپنے بیٹوں کی وجہ سے۔۔۔‘

اس کا چہرہ نفرت انگیز دکھائی دے رہا تھا اور اس کی بیوی خاوند کی بے وفائی پر ناراض تھی۔ اس کا وہ منہ جو کبھی یہ کہتے نہ تھکتا تھا کہ دربار پر انحصار کرنے والے کو دربار کا غلام نہیں ہونا چاہیے اب اس کی بیوی کی آنکھوں میں گوبر کے ڈھیر سے بھی زیادہ غلیظ دکھائے دے رہا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ اس کا احساس کیے بغیر کہ وہ کیا کر رہی ہے اس نے اپنے خاوند کے منہ پر تھوک دیا۔

اس شدید بے عزتی کے بعد سنگ زو خاموشی سے اپنی مطالعہ گاہ میں چلا گیا۔ اگلی صبح جب پو پھٹ رہی تھی باغ کی صفائی کے لیے آنے والے ملازم نے اپنے سامنے گھر کی مالکہ کی اکڑی ہوئی لاش دیکھی۔ یون سی نے اپنے گھر کی سب سے اونچی منزل کے شہتیر سے بندھے سفید تولیے کے ساتھ لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔

خامسنگ بری ناک

(تھائی لینڈ)

## سیاہ چشمہ

وہ ایک عام ملاقاتی کی نسبت زیادہ آشنا تھا اگرچہ اس کے بارے میں صرف جانا گیا تھا اسے دیکھا نہیں گیا تھا۔ وہ اکثر اپنی غیر مرئی ٹانگوں سے ماں کے دل میں اترتا اور پھر اسے چھوڑ جاتا، ہمیشہ کی طرح بے چہرہ۔ وہ آتا رہا اور جاتا رہا لیکن وہ نہ جان سکی کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ کبھی وہ نصف شب کے قریب آ جاتا اور کبھی صبح سویرے آدھمکتا اور شام تک ٹھہرا رہتا۔ یہ دھان کے کھیتوں میں بھی اس کے پیچھے جاتا اور جب وہ آگ کے لیے پتے اور لکڑیاں جمع کرتی تو وہ اس کے ساتھ رہتا۔ وہ ہر ایک سے نہیں ملتا تھا، صرف انہی لوگوں سے ملتا تھا جنہیں وہ اچھی طرح جانتا تھا مثلاً اس سے اور باپ سے بھی۔

چند روز پیشتر جب وہ مندر کے جشن کی تیاری میں مصروف تھی وہ غائب ہو گیا اور اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کب واپس آیا یا یہ وہ کہاں سے آتا ہے۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے بون پنگ کے لیے ایک نیا سا روٹنگ سی رہی تھی جب جنگل میں سے ایک سکھ کی آواز گونجتی ہوئی آئی۔ اس نے اپنا کام چھوڑ دیا اور کھیتوں کے اوپر دیکھا جہاں دو پہر کے نیلے آسمان کی نرم دھوپ کو پریشان کرنے کے لیے نہ ہوا تھی نہ بادل۔

دھیمی لیکن اداس گونج سارے منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں پلانا کراپنے آس پاس کے خالی پن کو دیکھا۔ بون پنگ کا کبل برآمدے میں بچھے درمی پڑھیر کی صورت میں پڑا تھا جس پر وہ سویا کرتا تھا۔ اس سے پرے اس کے اور اس کے خاوند کے کمرے کے ساتھ



بائس کی ایک دیوار تھی اور اس کے ساتھ پکا کمرہ تھا، جس کی لکڑی کے تختوں کی دیواریں تھیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور وہ خالی تھا۔ وہ دیر تک اسے گھورتی رہی اور شاید تبھی وہ کرب اس کے جی میں گز گیا۔ اگر آس پاس کوئی بھی سانس لینے والی شے ہوتی تو وہ اکلا پے کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوتی۔ چھت کے شہتیز کے ساتھ چھٹی ایک چھکلی، اس کے سر کے قریب سے گزرتی کوئی بھڑ۔۔۔ کوئی بھی چیز۔۔۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گھر کے سامنے والے درخت کے ساتھ جو پہلی چڑیا چمٹی رہتی تھی وہ بھی جا چکی تھی۔ اس کی غیر موجودگی نے اسے ایک اور پرندے کی یاد دلانی جسے وہ بھول چکی تھی اور جس کا پنجرہ چھجے کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر اس نے کچھ سکون محسوس کیا اور جو نبی وہ قریب آئی پرندے نے اپنے پردوں کو پھڑ پھڑایا اور گردن لمبی کر کے کونے لگا۔ اپنی آنکھوں میں تیرے آنسوؤں سے بے خبر اس نے گہرے سائے میں آئے ہوئے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اس کا باپ اکثر بے حس و حرکت کھڑا رہتا اور اتنی دیر تک کھڑا رہتا کہ وہ اس کے بارے میں فکر مند ہو جاتی کہ اسے ہوا کیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن آج پیشتر اسے کبھی پتا نہیں چلا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا تھا۔

اس حقیقت پر مشکل سے یقین آتا تھا کہ آج کے دن اس جشن کو گزرے تین برس ہو چکے تھے شاید آج کے دن تو نہیں۔۔۔۔۔ دراصل اس موسم سے کئی ماہ پیشتر، کاشت کے بعد، ایک چمکتی دوپہر میں یہ سب کچھ شروع ہوا۔ وہ اور اس کا خاوند جلد لوٹ آئے اور انہوں نے اپنے گھر کے سامنے آم کے درخت کے نیچے ایک کارکھڑی دیکھی۔ وہی کار جس نے متعدد بار ماں کو ڈھول کے ایک بادل میں لپیٹ دیا تھا۔ اس سے اڑتی ہوئی گردیں وہ اسے صاف تو نظر نہیں آتی تھی لیکن وہی تھی۔ یہ ڈونگ کیم کے دیہاتیوں کے لیے ایک نئی چیز تھی اور ماں انوہوں کے ذریعے سے جانتی تھی کہ یہ انجینئر کی کار ہے۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ وہ لوگ کب آئے تھے لیکن انہیں اپنی بیٹی کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ انہیں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ باپ سیدھا گھر میں چلا گیا تھا جب کہ ماں آموں کو سنبھال رہی تھی اور اس کے ساتھ اپنی بیٹی پر نظر رکھ رہی تھی جو کمرے پر بیٹھی کپڑا بن رہی تھی۔ وہ دو شخص، جو لمبی آستنیوں والی نیلی قمیصیں اور ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے، اس کے پاس کھڑے تھے اور سازشی انداز میں مسکرائے جا رہے تھے چونکہ وہ دونوں سیاہ جٹھے لگائے ہوئے تھے اس لیے ماں یہ نہ جان سکی کہ ان کی عمریں کیا ہیں۔

”تم تو پیدا ئی حسینہ ہو، کام خام۔۔۔“ کر گئے اوپر جھکے ہوئے شخص نے کہا۔



دالوں کی طرح ماں بھی بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر باپ اپنی بیٹی کے ساتھ بہت لگاؤ رکھتا ہے تو یہ صرف اس لیے نہیں کہ وہ اکلوتی اولاد ہے بلکہ اس کی کچھ اور وجوہات بھی تھیں۔ ڈونگ کام گاؤں میں آنے سے پہلے اس کے خاوند نے ایک جگہ سے دوسری جگہ اتنی بار ہجرت کی تھی کہ اسے اس کی عادت ہو گئی تھی۔ لیکن جب وہ ڈونگ کام پہنچے تو اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ کہیں نہیں جائیں گے اور دھان کے کھیت کی صفائی کرنے چلا گیا تھا۔ جب اگلے برس کام خام پیدا ہوئی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے اس کا نام خود رکھا اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کیوں کہ اس نے پہلے کبھی اپنے بچوں کے نام خود نہیں رکھے تھے۔ اور جب بچی کمزور رہ گئی تو اس نے اپنے آپ کو قصور وار ٹھہرایا کہ اس نے اپنی بیوی کو سخت کام پر لگائے رکھا۔ اسے کام خام سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ ہر قیمت پر اسے مشقت آمیز کام سے بچانا چاہتا تھا اور اس وجہ سے اس کے ہمسائے اور گاؤں کے لوگوں سے اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ان کا مکان دھان کے کھیتوں کے کنارے الگ تھلگ واقع تھا اس لیے وہ خاص طور پر اس کے گرد باڑ لگاتا تھا۔ ایک روز چند مقامی لڑکے جو اسے تنگ کرنے میں بہت لطف لیتے تھے، باڑ کے باہر کھڑے ہو کر کہنے لگے: ”باڑ کا ٹنوں سے بنائی جاتی ہے نرم بانس سے نہیں جو تم نے لگائے ہیں۔“ اگرچہ وہ کسی کے مشورے پر عمل کرنے والا شخص نہیں تھا لیکن اگلے ہی روز وہ جنگل میں گی اور باڑ کو مضبوط کرنے کے لیے نوکدار بانس کھود لایا۔ جو سڑک بنائی جا رہی تھی اس نے دو دروازے دیہاتوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے گاؤں کے ہر گھر کو بھی ایک دوسرے سے ملا دیا تھا۔ اس سے لڑکوں کو اسے چھیڑنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ”کانٹے بیلیوں اور لڑکوں سے تو بچا سکتے ہیں لیکن کاروں کا کیا ہوگا۔“

باپ کی پریشانی تب شروع ہوئی جب بارش کے بادلوں سے آسمان خالی ہو گیا۔ ڈونگ کام ایک دور افتادہ گاؤں نہ رہا۔ گاؤں والے نئی سڑک کی تعمیر سے بے حد خوش تھے۔ وہ اب کافی کی دوکان کے چھجے تلے جمع ہوتے اور اب وہ پہلے سے زیادہ باہر جانے لگے تھے۔ نوجوان نسل، لڑکے اور لڑکیاں تعمیراتی سامان سے لدے ٹرکوں پر بیٹھ کر ضلعی قصبے تک چلے جاتے اور جب وہ واپس آتے تو انھوں نے شوخ و شنگ رنگوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ باپ پہلے سے زیادہ مندر جانے اور بہت لیے دیے رہنے لگا تھا۔

”اگر ممکن ہوتا تو میں اسے ملتی کر دیتا۔“ وہ اس میلے کے بارے میں بات کر رہا تھا جو ہر برس کے چوتھے مہینے میں منایا جاتا تھا۔ ”اگر کسی کو بھی کوئی دلچسپی نہیں تو مجھے کیا پڑی ہے۔“

لیکن اس کا اندازہ غلط تھا۔ بہت جلد لوگوں کو نئی چیزوں کی عادت ہو گئی۔ وہ اجنبیوں اور سڑک پر ٹریفک کے عادی ہو گئے اور انہوں نے پھر جشن کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا۔ اگرچہ وہ پہلے والی بات اب نہ تھی۔ اس مرتبہ اس کا آغاز سرخ اور سبز رنگ کے کارڈوں سے ہوا جو قصبے سے چھپوائے گئے تھے اور یہ کارڈ تمام خاندانوں کو یہاں تک کہ گاؤں سے باہر رہنے والے لوگوں کو بھی بھجوائے گئے تھے۔ جشن کی رات جو مندر اس سے پیشتر مشطوں اور اگر کی روشنی سے گلانی اور گرم ہوا کرتا تھا اسے اب ایک جزیئر سے پیدا ہونے والی بجلی کی چندھیانے والی روشنی سے جگمگایا گیا تھا اور اس میں لوگ اور موسیقی بھری ہوئی تھی۔ چپوترہ، جو اس سے پیشتر کیلے کے تازہ پتوں، کما د اور جنگلی پھولوں سے سجایا اور تازہ تازہ لگا کرتا تھا اب اس پر کئی رنگوں والا بھڑکیلا سیلو فین مڑھا گیا تھا۔ مندر کے احاطے میں کاروں، ٹرکوں اور بسوں کی بھرمار تھی۔ پروہت کا وعظ لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے اتنا بلند تھا کہ آس پاس کے کئی دیہات میں سنا جاسکتا تھا۔

ماں کا بہکتا ہوا دماغ ایک لمحے کے لیے پھر سینے پر ونے کی طرف منتقل ہوا لیکن فوراً ہی پرندے کے پنجرے کی طرف چلا گیا۔

اس کی آنکھیں چمکدار سرخ اور چھوٹی تھیں۔ جب بھی ماں حرکت کرتی وہ اپنا سر ہلاتا اور کوکتا۔ بڑے سکھ کی آواز پھر گونجی۔ اگرچہ اب بھی اس کی آواز پہلے کی طرح نرم تھی لیکن اکلا پے کا تاثر زائل ہو چکا تھا۔ اس نے پنجرے کے پار دھان کے کھیت کو دیکھا جہاں کچھ لوگ درختوں سے نکل کر پرے جا رہے تھے۔ سکھ کی آواز کے بار بار آنے لگی اور اس کے ساتھ وقفے وقفے سے ہجوم کے نعرے سنائی دینے لگتے۔ جونہی وہ قریب آئے اس نے آگے آگے آنے والی پاکلی کو دیکھا جس میں بوڑھا پروہت بڑی بنجیدگی سے براجمان تھا۔ دو ایسے شخص بھی تھے جو مسخرے پن سے لوگوں کو ہنسا رہے تھے، ان کے لبا دے سبز اور ارغوانی تھے اور وہ دساندر کے بچوں کی اداکاری کر رہے تھے جو بعد میں بدھ ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے گاؤں والے پھول اور جنگلی درختوں کی ٹہنیاں لیے چلے آ رہے تھے۔ اس کا خاندان سب سے پیچھے سکھ اٹھائے ہوئے آ رہا تھا۔ وہ انھیں تب تک دیکھتی رہی جب تک کہ وہ گاؤں کے موڑ پر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد مندر کے ڈھول کی گہری آواز آئی جو دنیا کو بتا رہی تھی کہ مہا تما بدھ پچھلے جنم سے لوٹ آئے ہیں۔ اس کے بعد منبر کو پھولوں اور پتوں سے سجایا جانا تھا۔

ماں کو اب یاد نہیں تھا کہ چھوٹا پرندہ کب ان کی چھت پر اترتا تھا۔ اس لیے اندازہ لگایا

کہ شاید تب کی بات ہے، جب وہ اتنی پریشان تھی کہ اسے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ چاند گھٹ رہا ہے یا بڑھ رہا ہے اور اس کا خاوندان دونوں چُپ رہتا تھا۔ جب اس کے دکھ میں کچھ کمی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ پرندے کے پنجرے کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے لیکن اس نے کبھی اس سے دریافت نہ کیا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ دراصل وہ پہلا دن تھا جب اس نے پرندے کو غور سے دیکھا تھا۔ ایک پیاری شے جو لگتا تھا ناکلم پاؤ ڈر سے بنی ہوئی ہے۔ وہ اس چھوٹے سے پرندے سے بے پناہ پیار کرنے لگی۔ اور اب وہ اپنے خاوند کو بھی سمجھنے لگی تھی۔ اس کی ظاہری لاپرواہی کی وجہ بیٹی کی گم شدگی تھی۔ یہی اس کی بیماری کی وجہ تھی۔ اس کا دل دکھ کے بوجھ تلے ڈوبنے لگا۔

تین برس پیشتر کے اس جشن کے بعد اسے یقین تھا کہ اس کا خاوند دوبارہ مندر نہیں جائے گا اور نہ ہی وہ دوبارہ ایسا شاندار جلوس دیکھے گی جو ابھی گزر رہا تھا۔ کھیت ابھی تک اچلے تھے۔ ہوا میں خشکی تھی اور وہ جانتی تھی کہ دکھ، وقت کے ساتھ، اگر زندگی ہو تو کم ہو جاتا ہے۔ باپ سورج ڈوبنے سے پیشتر گھر آ گیا۔ اگرچہ وہ تھکا ہوا تھا لیکن تقریب کے بعد اس کا چہرہ حمانیت سے بھر پور تھا۔ اس کے ہاتھ میں زعفران کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو پنجرے کے قریب دیکھا تو تھوڑا سا ہچکچایا۔

”یہ کتنی چھوٹی سی پالتو چیز ہے۔“ اس نے اس طرح کہا جیسے اس کے پاس اس سے بہتر کہنے کو اور کچھ نہ تھا۔

”ہاں یہ ہے۔“

”اسے اتنے عرصے تک پنجرے میں بند رکھنے کا ارادہ تو نہیں تھا۔ تمہیں پتا ہے میں چاہتا تھا کہ اس کے پر اُڑان کے قابل ہو جائیں تو میں اسے آزاد کر دوں۔ تین سال بیت گئے ہیں۔ میں نے اسے خاصی اذیت دی ہے، کتنی شرم کی بات ہے۔“

”ہاں“ ماں نے صرف یہی کہا۔

اگلی صبح پرندے پر زعفرانی پانی ڈالنے کے بعد، کہ یہ خوش قسمتی کے لیے تھا، وہ اسے مندر لے گیا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ وعظ سن رہا۔ جب ابواب کے خاتمے کا سکہ بجا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ وہ تین بار پروہت کی طرف جھکا اور پھر ریگلتا ہوا منبر کے پاس چلا گیا جہاں پنجرہ پڑا تھا۔ جب پرندے نے اسے دیکھا تو نرمی سے کوکنے لگا۔

وہ خوشی سے مسکرا دیا۔۔۔ اس کا ہمایہ چونچ کٹکانے لگا۔



باپ بے سدھ سا اپنی بیٹی کو دیکھنے لگا جو غیر یقینی انداز میں راستے پر چلتی آرہی تھی۔  
ماں اوپر سے نیچے آئی اور رونے لگی۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے ہاتھ پر رکھے چھوٹے  
سے پرندے کو دیکھنے لگا جس کے پروں تلے ابھی زعفران لگا ہوا تھا۔

گون تھی

(جہوریہ دیت نام)

## رخصتی

نگا اُس وقت آنا نہیں رہی تھی جب چن اُسے خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ اُس نے اپنے کندھے کو جھٹک کر بالوں کی وٹھ پرے کی جو اُس کی گردن کو چھو رہی تھی اور پھر اپنی سہیلی کی جانب سے حیرت سے دیکھا ”تو کیا تم واقعی جا رہی ہو؟“

”ہاں۔“ چن نے جواب دیا۔ ”میں جشن کے دوسرے روز جاؤں گی۔“

”اوہ خدایا۔۔۔!“

دونوں سہیلیاں بغل گیر ہو گئیں۔ جوں جوں جدائی کا لمحہ قریب آتا گیا توں توں پرانی یادیں تازہ ہوتی گئیں۔ چن کی جانب دیکھتے ہوئے نگا بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ایسے لمحات گزار چکی تھیں۔ جو بھلائے نہیں بھولتے۔ خصوصاً وہ دن جب وہ دونوں ایک ”جنگلی نقطہ نظر سے اہم گاؤں“ کو تباہ کرنے کے لیے گئی تھیں۔ واپسی پر، رات کے وقت، دشمن کے حملے کے ڈر سے وہ پانی سے بھرے ہوئے کھیت کے درمیان میں بٹھیں پالنے والے ایک شخص کو چھو پڑے میں سوئی تھیں۔ اگلی صبح جب وہ بیدار ہوئیں تو ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ اور تب وہ راتیں بھی تھیں





دوسرے کو نے تک بے خطر پرواز کر سکتے تھے۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ این۔ ایف۔ ایل۔ بڑے پیمانے پر حملے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ گاؤں کے گوریلا پونٹ کے سربراہ کے طور پر جنگ میں حصہ لینے کے لیے اس نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ نگا، ہا اور دوسرے رنگروٹ کھ پٹلی فوجیوں سے دودو ہاتھ کر سکتے تھے گرچہ کچھ پتلوں کو امریکی امداد بھی حاصل تھی۔ وہ مردوں کے ہمراہ رات کو دریاعبور کریں گی اور ضلع مرکزوں کے کامیڈوں کے ساتھ جا ملیں گے۔

”اماں، میرا خیال ہے فرنٹ نے جو زمین ہمیں الاٹ کی ہے اُس پر تمہیں گنا اُگانا

چاہیے۔“

”اُس کے بارے میں فکر نہ کرو۔ تم جا کر اچھی طرح سے لڑو۔“

ماں نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ اُسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ اس طرح گفتگو نہیں کر رہی جیسے کہ عموماً کیا کرتی ہے۔ اس گھر میں ہمیشہ سے وہ اُسے بتایا کرتی تھی کہ اُسے کون سا کام کیسے کرنا چاہیے لیکن اب اُس کی بیٹی اُسے نصیحت کر رہی تھی۔ حال ہی میں فرنٹ نے اُسے دو کوئنگ زمین الاٹ کی تھی۔ تقریباً بیس کوئنگ زمین اُس حفاظتی علاقے میں سے حاصل کی گئی تھی جہاں دشمن کی چوکیوں کو تباہ کر دیا گیا تھا۔ اب بچے آزادی سے وہاں کھیل سکتے تھے اور بھینسین چراگتے تھے تاکہ دشمن کے جہاز نہ آجائیں۔ اس دوران جنھیں زمین الاٹ کی گئی تھی وہ اُسے کاشت کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

”تم کہاں جاؤ گی؟ صوبائی صدر مقام میں یا آزاد کردہ علاقے میں؟“ ماں نے

پوچھا۔

”میں وہیں جاؤں گی جہاں مجھے بھیجا جائے گا۔ تم گنا ہی اُگاؤ گی نا اماں؟“

”ہاں“

”اگر تمباکو کاشت کرو گی تو تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اُسے سیراب کر سکو۔“

ماں کو یاد آیا کہ جب اُنھوں نے تمباکو کاشت کیا تھا تو اُس کی بیٹی روزانہ کھیت کو پانی دیتی تھی اور شکایت کا لفظ بھی اُس کی زبان پر نہ آتا تھا۔

”میں شاید ہمت کر لوں۔“ ماں نے جواب دیا۔ ”بس تم اپنی روانگی کی تیاری

کرو۔“

چون جس وقت فوج میں جا رہی تھی عین اُسی وقت گاؤں میں نئے قمری سال کے جشن کی

تیار ہی تھی۔ دن میں دو تین مرتبہ دشمن کے ہیلی کاپٹر ”جو ابی کاروائی“ کرنے کے لیے گوریلوں پر حملہ آور ہوتی اس کے باوجود کیک بنائے جا رہے تھے۔  
خواتین کے گوریلا یونٹ نے بہت عرصہ پہلے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے درخواست دی تھی۔ اس وقت جب دشمن نے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ہر دو پہر ”ڈان وے“ پہرے دار بالوں کو بنائے ہوئے، دھوپ کے چشے لگائے اور امریکی سگرٹوں کے گش لگاتے ہوئے پریڈ کرتے۔

”کیا میں تمہارے لیے ایک جھولنے والا تھیلا بنالوں؟ ابھی سے؟“  
”نہیں ابھی اُس کی ضرورت نہیں بیٹی۔“

اداسی ایک بادل کی طرح ہا کے چہرے پر چھا گئی۔ خاموشی نے دونوں سہیلیوں کو حقیقت کے قریب کر دیا۔

”اگر تم چوکی پر حملہ کرو گی“ چون نے کہا، ”تو پھر میرے حصے کی گولیاں بھی تم ہی چلا

دینا۔“

”بگنگ نہر عبور کر کے اپنے کامیڈوں کے ساتھ ایک مشترکہ حملہ کر دو۔“  
بانے کچھ دیر کے لیے سوچا۔ جس پھڑکی سے وہ خطرے کی گھنٹی بجاتی تھی اُس کے ساتھ اپنے گال رگڑتی رہی اور پھر فوری طور پر بولی، ”ہم سب لڑکیاں بالکل تنہا ہوں گی؟“  
”تم ہمارے مردوں کے ساتھ جا کر جنگ میں حصہ کیوں نہیں لیتیں؟“  
”کیا خیال ہے، تم جشن کے خاتمے تک گھر میں کیوں نہ رہو؟“

اس پر پرانی یادیں پھر ذہن میں تیرنے لگیں۔ ایک مرتبہ ہا، چون کو ضلع کی منڈی میں لے گئی تھی تاکہ یہ دیکھا جائے کہ یہ امریکی مداخلت کا شکل و صورت کے کیسے ہوتے ہیں۔  
چون گھر چلی گئی۔ اُس کی ماں کیک بنا رہی تھی اور ہنہ سورہا تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر اُس نے اُن کا جائزہ لیا۔۔۔ اور اُس نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اماں کے بال ابھی سیاہ تھے لیکن اُس کی نظراتی کمزور تھی کہ اُسے مٹی کے تیل کے لیمپ کے اوپر جھلنا پڑتا یہ دیکھنے کے لیے کہ آنا گوندھا گیا تھا یا نہیں، اُسے آنکھیں مچھنی پڑتی تھیں۔ چون نے اپنے آپ سے کہا: ”میں اماں اور چھوٹے ذہن کو، بہت جلد چھوڑ جاؤں گی۔“  
”تم اتنی دور جا رہی ہو کہ اگر تمہیں چھٹی ملی تو گھر کیسے آؤ گی؟“ اُس نے اپنی بیٹی







ہمیں سے مسلح زندہ تھا تو بھی وہ اُسے خوفزدہ نہیں کر سکا تھا اور اس وقت، جب کہ وہ گلے مڑے گوشت کا ایک پلپلا ڈھیر تھا، وہ اس سے متاثر ہو گئی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ گاؤں والے لیمپ اٹھائے گولوں کی پیٹیاں اور پیرا شوٹ اٹھانے جا رہے تھے۔ جلتے ہوئے گنے کی تیز اور میٹھی خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ چائے پی رہے تھے، بحث کر رہے تھے کہ ہمیں کے گڑھوں کو کیسے بھرا جائے، گھروں کو کیسے دوبارہ تعمیر کیا جائے اور سکول اور مارکیٹیں کیسے پھر سے بنائی جائیں۔

نگا نے پوچھا: ”کیا بچے منڈی والی جگہ میں سکول جائیں گے؟“

چن نے اپنی دوست کے لمبے بدن کو دشمن کے پیرا شوٹ گولوں کی روشنی میں دیکھا۔

”منڈی کل ہمارے سپاہیوں نے آزاد کروائی تھی۔“ اُس نے کہا ”کیا تمہیں علم

نہیں ہے؟“ اس فاتحانہ جنگ نے تینوں لڑکیوں کو مختلف سطحوں پر بٹھا دیا تھا۔ نگا نے سوچا: ”یہ کچھ

عجیب سا لگے گا کہ منڈی لے جا کر بچوں کو قرض کرنا اور گانا سکھایا جائے۔“ ہا اب دشمن کی

بمباری سے خوفزدہ نہیں تھی لیکن وہ اب بھی ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی جہاز عین اُس کے سر پر نہ

اگرے۔ اور جہاں تک چن کا تعلق ہے وہ اس دنیا میں ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے بلاوجہ غصے

میں آ رہی تھی۔

گاؤں کی سرحد پر جو پتھر پللی سڑک تھی، جس پر ”ڈان وے“ محافظ دھوپ کے چٹھے

لگائے اور سائیکل رکشاؤں میں بیٹھے گشت کیا کرتے تھے، اب ایک چھوٹے سے راستے میں بدل

چکی تھی جس میں لوگوں نے سُورخ اور خندقیں کھود رکھی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ منڈی کی

طرف جانے اور وہاں سے آنے والی عورتیں چل رہی تھیں۔ ہر صبح ضلعی منڈی سے واپس آتے

ہوئے بوڑھا ہائے نگانگ جدوجہد کرنے والے گاؤں کے ساتھ لگی خاردار تار کی قریب اپنی

بائیکل سے جھکتا اور اپنے ہاتھ پر پان کا کچھ حصہ ٹھوک کر ایک اخبار لہراتے ہوئے کہتا: چن، تم

کہاں ہو؟ ادھر آ کر سمندر اور خشکی پر چلنے والی لاریوں کی تصویر تو دیکھو۔“

عام طور پر جب یہ آشنا آواز سنائی دیتی تو گاؤں والوں کو پتا چل جاتا کہ ایک نئی فتح

نے جنم لیا ہے۔ وہ گھروں سے باہر نکل کر اُس کے چاروں طرف ایک دائرہ بنا لیتے۔

”عظیم فتوحات“، ”وہ کہتا“، ”ہم نے دشمن کی پوری بٹالین لوٹگ آن میں نیست و نابود

کر دی ہے۔ ایک بٹالین میں کتنے سپاہی ہوتے ہیں؟ تقریباً پانچ سو۔“ پھر وہ درزی کی بیوی کے

بارے میں باتیں کرنے لگتا جس نے لاج کی بیوی کی طرح بد نصیبی کو ڈور رکھنے کے لیے اپنے

دروازے پر تعویذ باندھ رکھا تھا یا ان پچاس امریکی فینٹم طیاروں کے بارے میں جو بن ہوا میں ہماری توپوں نے برباد کر دیے تھے۔ امریکہ کے سینکڑوں فوجی سائینگان میں ہلاک کر دیے گئے تھے، وہ کہتا جاتا بن گیا میں تو ہزاروں مارے گئے ہیں۔ ہمارے آباء و اجداد کی سرزمین پر طوفان اٹھ رہے تھے اور توپیں شعلے برسا رہی تھیں۔

اُن دنوں میں، جب ہر صبح فتوحات کی خبریں گونجی تھیں اور ہائے نگانگ کی دو تاروں والی والکن چاندنی راتوں میں سنائی دیتی تھی، چن اور دوسرے گوریلے بہت کم اپنے گھروں میں ہوتے۔ درجنوں دیہات آزاد کر لیے گئے تھے۔ اب بچے دن کی روشنی میں بھی یہ گاسکتے تھے: ”بدیو دار یا کی جونک“، نوکدار بانس کو تیز کرتے ہوئے چن اور اس کا گوریلہ یونٹ دور دور تک دشمنوں کا پیچھا کرتا۔ اکثر اوقات اس چھوٹے سے گاؤں میں فتوحات کی خبروں سے ہلچل مچ جاتی یا پھر محاذِ آزادی کے سپاہی گزرتے یا ہیلی کاپٹروں کا کوئی حملہ ہوتا اس کے فوراً بعد یہاں کے لوگ روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ کسی شے کی آمد کا انتظار کرتے ہوئے اور خواب دیکھتے ہوئے، کسی تالاب میں مچھلی کا پونگ ڈالتے ہوئے یا پھر ہائے نگانگ کی طرح اپنی جب کا آخری سکہ بھی گوریلوں کے لیے رائفلیں خریدنے پر خرچ کر دیتے۔ اب زندگی میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بہت ہی قیمتی تھا اور ہر ایک اُسے بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا، یہاں تک کہ وہ مرغ بھی بچایا جانا چاہیے تھا جسے دشمن نے زخمی کر دیا تھا۔

ایک صبح ہائے نگانگ کھانا کھا رہا تھا کہ چن آگئی۔

”میں تمہیں خدا حافظ کہنے کے لیے آئی ہوں چچا۔ میں فوج میں جا رہی ہوں۔“

”تم اب جا رہی ہو؟“ ہائے نگانگ نے عینک اُتار دی۔

”تمہارے ساتھ بھی کوئی جا رہا ہے؟“ اُس نے دوبارہ پوچھا۔

”باگپے۔۔۔۔۔ نام ٹو۔۔۔۔۔ محاذِ آزادی کے سارے جوان۔ نئے رنگروٹ

ہماری جگہ لے لیں گے۔ اُن کی کمی نہیں ہے۔“

یک دم اس پُرانے سپاہی کو محسوس ہوا جیسے دُور کہیں ایک توپ پھٹی ہے۔ وہاں چن بیٹھی تھی گول گول رخساروں، نوکدار ٹھوڑی اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ جو مرغیوں کو دیکھ رہی تھیں۔

ہائے نگانگ نے اپنے والکن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔



’’شہزاد کے کھیل میں امریکی پھنس چکے ہیں، اس مرتبہ تم انہیں مات دے دو گے۔‘‘  
 جشن کے تیسرے روز سڑک مختلف رنگوں کی سائیکلوں سے بھری ہوئی تھی۔ فتح کی نوید  
 سناتے ہوئے پوسٹر ہر چوراہے پر لٹکے ہوئے تھے۔ گاؤں کی سرحد پر واقع سڑک پر ریت اڑتی تھی  
 اور اس کے ساتھ باورچی خانوں سے لذیذ خوشبو آتی تھی جہاں سفید قمیضوں میں ملبوس لڑکیاں کام  
 میں مصروف تھیں۔ خندقوں کو پختہ کر لیا گیا تھا۔ زیر زمین سڑگوں میں بچے گیت گاتے تھے۔ رنگا اور  
 ہا، چن کے ساتھ سکول کے صحن تک گئیں جہاں گوریلے ایک شیر رقص کر رہے تھے۔ وہ اپنے  
 کامیڈوں کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

باگیجے حسب معمول اپنی گوریلوں والی وردی میں تھا: سیاہ پینٹ اور پختہ جرابیں،  
 ایک ایسی قمیض جس پر دو جیبوں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بانس کا بنا ہوا ایک ہیٹ تھا  
 جس میں پیراٹوٹ کا کپڑا لگا ہوا تھا۔ ہر کوئی اُس کی جانب دیکھتا، پھر رنگا کو دیکھتا اور ہنسی سے  
 لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

رنگا نے چن کا کندھا تھپکا اور کہا: ’’جتنی جلدی ہو سکے خط لکھنا، ٹھیک ہے؟‘‘  
 ماحول انتہائی خوشگوار تھا۔ ڈھول بج رہے تھے۔ بوڑھا ہائے نگانگ نوجوان فوجی  
 رنگروٹوں کو دیکھ کر انتہائی عقیدت سے بھرے لہجے میں کہنے لگا: ’’فوج میں تم اس طرح نہیں لڑو گے  
 جیسے یہاں لڑتے تھے۔ جب حملے کا حکم دیا جائے تو فوراً اس پر عمل کیا جائے۔ تم سمجھ رہے ہونا میں  
 کیا کہہ رہا ہوں؟ اس بار شہزاد کے کھیل میں ہمارے مہرے اُن کے شاہ کو مات دینے والے  
 ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اوہ، تم ان نوجوانوں کو تو دیکھو۔ سب کے سب کتنے چاق و چوبند  
 ہیں۔‘‘

چن کے لبوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے رُک سیک کندھوں پر ڈالا ہوا  
 تھا۔ پام کے پتوں سے بنے ہوئے ہیٹ کی ڈوری اُس کی ٹھوڑی کو بٹھور رہی تھی۔ سب کچھ اُس کے  
 ذہن میں تھا۔ زمین کا وہ کلزا، جو اُس کے خاندان کو ملا تھا، اب اُس پر تمباکو اور پھلیاں کاشت کی  
 جائیں گی۔ اُس کی ماں میں ابھی اتنی سکت تھی کہ اس کی دیکھ بھال کر سکے۔ چھوٹا ذہن اتنا بڑا تو ہو  
 گیا تھا کہ اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھ سکے۔ رنگا اب عورتوں کے گوریلہ گروپ کی سربراہ بن  
 جائے گی۔ اگرچہ با اپنی خواہش کے مطابق ابھی فوج میں نہیں جاسکتی تھی لیکن اُس کے پاس خاصا  
 وقت تھا۔ مزاحمت ابھی تادیر جاری رہتی تھی۔ اُسے سب لوگ اور سب کچھ یاد تھا بوڑھا ہائے

نگانگ، ہا کا دادا، کامریڈ ویٹ، گاؤں کے گوریلا یونٹ کا سربراہ اور پُرانی ایم۔ اے۔ ایس رائفل، وہ سڑک جس پر گوریلے چھاپے مارا کرتے تھے، وہ نہر جس پر بار بار فضائی حملے ہوتے تھے اور گنے کے قطار اندر قطار رکھتے جو ”جنگلی نقطہ نظر سے اہم گاؤں“ کے آس پاس تھے۔ اُسے ان سب کو چھوڑنے کا افسوس تھا۔ یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ وہ آزادی کے سپاہیوں کے ہمراہ ملک کے کونے کونے میں جائے گی، وہ اپنا پورا گاؤں تو ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی!

اس کی ماں نے تھوڑا سا دھانی ایک اُس کے رُک سیک میں رکھ دیا اور ہائے نگانگ سے کہنے لگی:

”ایک لڑکی کے طور پر اُسے اس دنیا میں لانے پر ہمیشہ مجھے مورد الزام ٹھہراتی رہی۔ اب ذرا اس کی آنکھوں کو تو دیکھو! ہمیشہ کہتی تھی میری بی بی خواہش ہے کہ میں فوج میں جا کر گاؤں کو آزاد کرواؤں۔ اب جب کہ ہمیں آزادی مل گئی ہے تو یہ ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہی ہے؟“

چن نے اپنا ہیٹ فضا میں بلند کرتے ہوئے سب کو خدا حافظ کہا۔ ڈھول بجنے لگے۔ نئے رنگروٹ مارچ کرنے لگے۔ بوڑھے ہائے نگانگ کو یوں محسوس ہوا جیسے بہت دُور تو ہیں دھاڑ رہی ہیں۔

میڈا سیو  
(ملائیشیا، سنگاپور)

## واپسی

ابھی صبح کا ذب تھی۔ سلیٹی رنگ کا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی پھوار شروع ہو گئی تھی۔۔۔ گاڑی چلنے والی تھی۔ اس پر بہت کم مسافر سوار تھے اور انھیں الوداع کہنے کے لیے آنے والے ان سے بھی کم تھے۔ جونہی بارش شروع ہوئی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے چند لوگوں میں کچھ ہل خیل ہوئی لیکن چنگ زے نے ان کی طرف دھیان نہ دیا اور اپنی چھوٹی سی نوکدار ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے، چہرہ اوپر کیے اپنی نشت پر تقریباً بے حس و حرکت بیٹھی بغیر کسی مقصد کے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا پوڈر لگا ہوا تھا اور اس کے بال جو ابھی کچھ دیر پہلے بنائے گئے تھے، اس کے کندھوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں اس کے چھوٹے، پتلے اور بیضوی چہرے کی مناسبت سے بہت بڑی لگ رہی تھیں۔ وہ سلیٹی رنگ کے آسمان کی طرف کچھ کھوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

وہ اپنے آپ میں گم یوں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس نے گردن اٹھا کر یہ دیکھنا بھی گوارا نہ کیا کہ اس کے آگے سے کون گزرا ہے یا اس کے برابر میں کون بیٹھا ہے۔ جب بارش اس کے چہرے اور ہاتھوں کو بھگونے لگی اور اسے سختی کا احساس ہوا تو اس نے جانا کہ موسم بدل چکا ہے اور کھڑکی سے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس کھولا اور اس میں نیلے رنگ کا ایک ہلکا اونٹنی

سو بیڑ نکال کر کندھوں پر ڈال لیا۔

بارش تیز ہو چکی تھی۔ صبح کا ذب کی سیاہی میں ریل کی پٹریاں ایک سرد چمک لیے ہوئے تھیں۔ انجن میں سے نکلتی ہوئی کونسے کی باریک راکھ صبح کی نمی آلود ہوا کے ساتھ مل کر سارے سیشن پر ایک بے جان دھند کی طرح پھیل رہی تھی۔

لوہے کے بڑے پھانکوں سے باہر بارش کے قطروں کے پردے کے پیچھے نوآبادیاتی شہر کی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں جو غیر مستحکم اور نیچی چھت والے 'اٹاپ' جھونپڑوں پر دیودوں کی طرح ٹھکی ہوئی تھیں۔ ایک جانا پہنچانا منظر جو انسان ہمیشہ دیکھتا تو ہے لیکن خالی نظروں سے، غور کیے بغیر۔

ہاں یہ ایک جانا پہنچانا منظر تھا۔ وہ اس شہر کے بارے میں تقریباً سب کچھ جانتی تھی۔ اس کے ساتھ دوستی کیے بغیر اس نے یہاں پورے دس برس گزارے تھے۔ اس شہر کی یادیں جو اس کے ذہن پر ثبت تھیں، آسانی سے مٹائی نہیں جاسکتی تھیں۔

دس برس۔۔۔۔۔ بہت بڑا عرصہ بھی نہیں ہوتا۔ جب اس نے شہر میں رہائش اختیار کرنے کے لیے گاؤں چھوڑا تھا تو وہ ابھی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ زندگی سے بھرپور اور بے خوف۔ اور اب وہ اٹھائیس برس کی تھی۔ اس جیسی عورت کے لیے اٹھائیس برس کی عمر خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے اور اسے اپنے مستقبل کے بارے میں بہر صورت غور کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب بھی وہ انیس سالہ لڑکے کے ساتھ ہوتی مستقبل کے بارے میں سوچنا اتنا ہی پریشان کرنا جتنا ایک لا علاج بیماری کرتی ہے۔ جب اس کے نوجوان اور گھٹے ہوئے بدن نے اسے چھوا تھا تو اسے یوں لگا تھا جیسے وہ بہت تیز شراب پی رہی ہے۔۔۔۔۔ جب اس نے محسوس کیا کہ وہ جسمانی اور جذباتی طور پر خالی ہو چکی ہے۔ اسے لمس کا وہ لمحہ پسند آیا تھا جب اس لڑکے نے اس میں زندگی کی قوت انڈیل دی تھی اور نوجوانی کا وہ جذبہ جسے وہ کھو چکی تھی مگر دوبارہ پانا چاہتی تھی۔

شاید مسرت اسی کا نام تھا۔ اُس نے اس پر یقین کر لینے کی پوری کوشش کی۔ اس مسرت کو گرفت میں لینے، اس سے لطف اندوز ہونے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنے کی اور پھر کھونہ دینے کی پوری پوری کوشش کی مگر وہ بری طرح ناکام رہی۔

ایک تیز سیٹی کی آواز آئی۔ گاڑی نے حرکت کی اور پُرشور انداز میں پٹریوں پر چلنے لگی۔ شہر ایک سلیٹی رنگ کی چادر میں لپٹا پیچھے رہ گیا تھا اور جوں جوں فاصلہ بڑھتا گیا توں توں



کشتی کے کھڑا ہونے کی جگہ کے نزدیک واقع تھی اور وہ اُس انیس سالہ لڑکے کے بازو کا سہارا لیے ہوئے تھی جس کے کندھے بہت چوڑے تھے۔ وہ اس تاریک راستے پر چل رہے تھے جو دریا کے ساتھ نیچے جا رہا تھا۔ آسمان پر ایک ایسا پورا چاند چمک رہا تھا جیسا صرف استوائی خطوں میں نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی چمکتی ہوئی کرنوں کا لبادہ دریا کی دائمی گندگی پر ڈال دیا تھا جس میں ادھر ادھر مردہ جانوروں کے بدبودار ڈھانچے تیر رہے تھے۔ گائیں، جنھیں گھروٹے میں دیر ہو گئی تھی لا پر وہاں سے ڈکار رہی تھیں اور اس سیاہ جھاڑی کی جانب جا رہی تھیں جو پہاڑی پر واقع گھروں کے پیچھے تھی لیکن اس سے ہر شے میں ایک جذباتی آمیزش تھی، خاص معانی تھے اور اس کا سریوں چکرار ہاتھ جیسے اس نے تیز شراب پی رکھی ہو۔

اُس راستے کے آخر میں تنگ پل کے پار، تفریحی پارک میں نیون روشنیاں چمکتی تھیں اور ان کی روشنی میں آسمان کا نصف حصہ ایک آتشی لودیتا تھا۔ وہ اس کے شانہ بہ شانہ چل رہی تھی، باتیں کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے جیسا کہ نوجوان کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس پارک میں واقع ’’ذریعہ جنت‘‘ کی سرنگ کی بھی سیر کی تھی۔ اس تاریکی میں یہ سیر بے حد پر لطف تھی۔ اس دوران میں جب کبھی کوئی بلا میں تلوار پکڑے اندھیرے میں سے نمودار ہو جاتی تو وہ اس سے خوفزدہ ہونے کی بجائے اسے ایک مزاحیہ شے سمجھتی۔ اس نے اپنی گردن پر اپنے ساتھی کے نوجوان داڑھی کی چھن محسوس کی تو اس نے اپنے آپ کو اس کے بازوؤں کے حوالے کر دیا کہ بے شک وہ اسے جتنا چاہے زور سے بھینچ لے۔ اس وقت اس کا خیال تھا اس کی ویران زندگی میں شاید ابھی خوشی آنے کی امید ہے۔

گاڑی ساحل کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سمندر کا رنگ سیاہی مائل سبز تھا اور کہیں کہیں بادامی رنگ کا کوئی مال گودام یا درختوں کا کوئی جھنڈ نظر آ جاتا تھا۔ یہاں سے سمندر پر تیرتی جھاگ نظر آ رہی تھی اور کچھ فاصلے پر چند کشتیاں جو بارش کی وجہ سے نامعلوم ہیولوں کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ اُسے سمندر سے اور سمندری جہازوں سے نفرت تھی۔ وہ سمندری جہاز اور سمندر ہی تھا جو اس خوشی کو بہا لے گیا تھا جس کی اس نے امید کی تھی۔

جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا یہ دریا پکنے کے موسم میں ہوا تھا۔ اس پھل کی عجیب و غریب مہک سے، جو نوواردوں کو پسند نہیں آتی تھی لیکن مقامی لوگوں کے منہ میں پانی بھر لاتی تھی، ساری

فضا میں رچی ہوئی تھی اور تب اس نے محسوس کیا کہ اس کے اور اس کے انیس سالہ نوجوان دوست کے تعلقات پر ایک سیاہ سایہ پڑ رہا ہے۔

وہ نوجوان جو اب تک بے حد خوش و خرم تھا چپ رہنے لگا تھا۔ وہ حسب معمول ایک دوسرے میں گم ہو کر ایک دوسرے کو چومتے لیکن وہ وہاں نہ ہوتا تھا۔ بس خالی فضا کو گھورتا رہتا۔ اس کے چوڑے ماتھے پر جو عام طور پر بے فکر اور ہموار ہوتا تھا۔ اب فکر کی لکیریں ابھر رہی تھیں۔

’اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔‘ وہ بے چینی سے سوچتی۔

لیکن وہ اسے کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ صرف تیوری چڑھاتا اور بس۔ بالآخر وہ اس بوجھ کو نہ سہا رہا جو اس کے ذہن پر تھا۔ ’میں اس جگہ کو چھوڑ دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑنا چاہتا۔‘

’تم یہاں سے چلے جانا چاہتے ہو؟ تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا کیسے؟‘ وہ اس کے بازوؤں سے الگ ہو کر بولی۔ ’کیا تم یہاں خوش نہیں ہو؟‘

’نہیں میرا اس ملک سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ تمہارے لیے اچھا ہے لیکن میرے لیے نہیں۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ اس زمین میں میری جڑیں نہیں ہیں۔ میں کب تک اپنے آپ کو یہاں گھسیٹتا رہوں؟ یہاں کی زندگی مجھے تباہ کر رہی ہے۔‘

’اگر تم یہی چاہتے ہو تو ٹھیک ہے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔‘

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی۔

’تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے ڈارلنگ؟‘ وہ اسے بازوؤں سے جھنجھوڑتے ہوئے

بولی۔

اس نے نظریں جھکا لیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ یکدم اس کے ذہن میں روشنی کا ایک کوند لپکا اور وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ اٹھائیس کی تھی اور وہ صرف انیس برس کا۔ ان کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل تھی۔ وہ کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔

’ہاں، میں سمجھتی ہوں۔ تم جاؤ، چلے جاؤ، میں تمہیں نہیں روکوں گی،‘ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور اپنے جذبات چھپانے کے لیے اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور رونے لگی۔

وہ اسے دو دن تک ملنے نہیں آیا اور پھر ڈاکیہ اس کا ایک خط لے کر آ گیا۔ اس نے  
لرزتی انگلیوں کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔

ڈارلنگ!

مجھے افسوس ہے لیکن نہ جانا میرے بس میں نہ تھا۔ جب تم یہ خط پڑھو گی تو ہمارے  
درمیان سمندر حائل ہو چکا ہوگا۔ ہر شے کے بارے میں بھول جاؤ اور۔۔۔۔۔ اس نے خط کو  
ایک جانب رکھ دیا کیونکہ وہ اسے آخر تک نہ پڑھ سکتی تھی۔

کنڈکٹر نے ڈبے کا دروازہ کھولا تو راہداری سے بخ ہوا شرانٹے بھرتی ہوئی اندر آ  
گئی۔ سردی کی وجہ سے وہ اپنے خواب سے بیدار ہو گئی اور اس نے کسی ٹھنڈی شے کو اپنے چہرے  
پر محسوس کیا۔ اس نے ہاتھ اوپر کر کے دیکھا تو اس کے رخساروں پر آنسو بہ رہے تھے۔ اس نے  
کنکھیوں سے اپنے ہم سفر کی جانب دیکھا۔ خوش قسمتی سے وہ یا تو سو رہے تھے یا مطالعے  
میں مشغول تھے۔ جو لوگ اپنے بچوں کے ہمراہ سفر کر رہے تھے وہ ان کے ساتھ کھیل رہے تھے اور  
یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بھی اس کی موجودگی کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

گاڑی ایک چھوٹے سٹیشن میں داخل ہوئی اور رک گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر  
دیکھا۔ یہ ایک قصباتی سٹیشن تھا۔ بہت پرانا اور چھوٹا سا۔ خستہ حال۔ ٹانکوں والی چھتوں کی ایک  
قطار کے ساتھ۔ اس نے اس مقام کو فوراً پہچان لیا۔ دس برس پیشتر وہ شہر جانے کے لیے یہاں  
سے گزری تھی۔ وہ اس زمانے کی نسبت کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوا تھا لیکن ابر آلود آسمان کی وجہ  
سے اس پر اداسی چھائی ہوئی لگتی تھی۔

بارش ابھی تک برس رہی تھی۔ سٹیشن ویران پڑا تھا۔ بہت کم مسافروں نے وہاں سے  
گاڑی پکڑی یا وہاں اترے۔ ایک بارہ تیرہ سالہ ”کامپانگ“ لڑکا نمک لگے انڈوں کی ٹوکری  
اٹھائے اس کے پاس آیا۔ وہ اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے بھیک مانگ رہا ہو۔  
دس برس پیشتر جب وہ یہاں سے گزری تھی تو بالکل اسی قسم کا ایک لڑکا نمک لگے  
انڈے فروخت کرنے کے لیے اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا، کچھ پیسے نکالے  
اور ایک انڈا خرید لیا۔ اس لیے نہیں کہ اسے اس کی ضرورت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو  
یاد دلانا چاہتی تھی کہ دس برس پہلے اس نے اسی سٹیشن سے ایک ایسا ہی انڈا خریدا تھا۔  
اس کا اپنا قصبہ اب کیسا لگتا ہوگا؟ وہ کچھ زیادہ تو نہیں بدلا تھا لیکن اس کی خالہ کے



ایک خط کے مطابق وہ بہت جدید ہو چکا تھا اور کافی ترقی کر چکا تھا کیوں کہ وہاں برطانوی فوجیوں کا ایک دستہ تعینات تھا۔ زمین کی قیمت بڑھ گئی تھی۔ اس کی خالہ نے بتایا تھا کچھ لوگ زمین کے اس ٹکڑے کی بہت اچھی قیمت لگا رہے تھے جس پر اس کا باپ سبزیاں اگا یا کرتا تھا۔ وہ گزشتہ برس جنوری کے مہینے میں فوت ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے دوست لڑکے کے ہمراہ تھی جب اسے وہ خط موصول ہوا تھا اور چونکہ اس کا گاؤں واپس جانے کا کوئی ارادہ ہی نہ تھا اس لیے اس نے اپنے باپ کی وفات کے بارے میں کچھ زیادہ پروا نہ کی تھی۔ اور اب ایک شکستہ دل لیے وہ واپس جا رہی تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اس شہر میں رک نہیں سکتی تھی جس نے اسے بے انتہا مسرت دی تھی اور پھر اتنا ہی دکھ بھی دیا تھا۔ اور دوسری وجہ، وہ مانے چاہے نہ مانے، یہ تھی کہ وہ ایک پرانے جاننے والے سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خالہ نے اپنے آخری خط میں اس آدمی کے بارے میں کچھ لکھا تھا۔ وہ سکول ماسٹر، جو اس سے ملاقاتیں کیا کرتا تھا، اب اپنی بیوی سے الگ ہو چکا تھا۔ ’وہ انتہائی خوفناک قسم کی عورت ہے‘۔ اس کی خالہ نے لکھا تھا۔ بظاہر یہ ایک عام سی بات جو اس کی خالہ نے یونہی لکھ دی تھی، اداس یادوں کے ایک سیلاب کا سبب بن گئی تھی اور اپنے تازہ زخم چانتے ہوئے ان یادوں نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ اس کو اس کا لمبو ترا بیضوی چہرہ اور اس روشن آنکھیں یاد آئیں جن سے آنسو آسانی سے بہ نکلتے تھے۔ ہاں وہ بے حد جذباتی تھا اور بالغ نہیں ہوا تھا جیسا کہ ایک مرد کو ہونا چاہیے۔ وہ اتنی آسانی سے آب دیدہ ہو جاتا تھا کہ کئی مرتبہ وہ اس کے سامنے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ وہ اس پر ترس کھایا کرتی تھی۔ لیکن ترس کھانا محبت کرنے کے مترادف نہیں اور بالآخر اس نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی گاؤں کو بھی۔۔۔ شائد مستقبل کے لیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شکل۔ اس کے پہلے پیار کی شکل۔ مدہم پڑنے لگی اور پھر یادوں کے انبار تلے دب گئی۔

یہ تو شخص ایک اتفاق تھا کہ خالہ کی خط و کتابت سے اس نے اپنے محبوب سکول ماسٹر کے بارے میں کچھ جان لیا تھا۔ اس کا اولین محبوب اور اسے اس کی دکھی شکل یاد آئی تھی جس نے اس کے ذہن میں کئی چیزوں کو چھیڑ دیا تھا۔ بہت ہی مدہم اور دیرینہ یادیں روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔

گاڑی اس کے قبضے کے نزدیک ہو رہی تھی۔ جوں جوں منزل قریب آتی جا رہی تھی

اس کے دل میں اپنی واپسی کے بارے میں اتنے ہی زیادہ شکوک سرائٹا رہے تھے۔ اس کی واپسی کی اصل وجہ کیا تھی؟ وہ کس لیے واپس جا رہی تھی اس پر اسے شرم بھی آئی لیکن وہ امید پرست تھی۔ ’زندگی دوبارہ شروع کرنے کا میرے پاس ابھی ایک موقع اور ہے‘ اس نے سوچا۔ یہ امید دوران سفر قائم رہی لیکن جب گاڑی لکڑی سے بنے ہوئے سٹیشن پر رُک گئی تو وہ ذہنی طور پر کچھ کھنسی گئی۔ یہ خوشی تھی؟ یا خوشی بھی اور ناخوشی بھی؟۔۔۔۔۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ ہینڈ بیگ میں سے نکالے ہوئے آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنے بال درست کی اور پھر اپنا سوٹ کیس اٹھا کر راہداری میں آئی اور مسافروں میں مل گئی۔

چھوٹا سا لکڑی سے بنا ہوا سٹیشن ویسا ہی تھا جیسا کہ دس برس پیشتر تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا، یہاں تک کہ وہی ہندوستانی اب بھی سٹیشن ماسٹر تھا۔ اس میں بھی صرف یہ تبدیلی آئی تھی کہ اب اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ پلیٹ فارم سے پرے بے شمار رکشے سوار یوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ انھیں چلانے والے ملائی تھے۔ ان میں سے ایک خوشی سے دمکتا ہوا بادامی چہرہ اس کے پاس بھی آیا لیکن اس نے اپنی جنم بھومی پر پیدل چلنا زیادہ بہتر جانا۔ سٹیشن سے باہر نکلنے ہی وہ مرکزی سڑک کی طرف جانے کی بجائے اُدھر چلنے لگی جہاں سے کھیت شروع ہوتے تھے۔ سفید گنبدوں والی ایک مسجد کے قریب سے گزرنے کے بعد وہ ناریل کے ایک چھوٹے سے باغ میں داخل ہو گئی۔ پھر ایک زرد لہروں والا دریا آیا جو پہاڑوں سے نیچے آ رہا تھا۔

ناریل کے باغ سے باہر آتے ہی اسے سامنے وہ جگہ نظر آ گئی۔ وہ حیرت زدہ ہو کر رُک گئی۔ یہ تو کسی کی بھی ملکیت نہیں تھی اور یہاں دریا کے دونوں طرف جنگلی گھاس پھونس اور سبزیاں اُگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے سکول ماسٹر کو یہیں ملا کرتی تھی۔ یہیں پر ان کے لب اور جسم ایک دوسرے سے آشنا ہوئے تھے لیکن سب کچھ بدل چکا تھا۔ اس جگہ دریا کے کنارے اب ایک مارکیٹ تعمیر ہو چکی تھی جہاں بکے مکان اور دوکانیں تھیں۔

وہ جذبہ باقی طور پر بہت دکھی ہوئی اور اسے اپنے اندر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ وہ دریا کے ریتلے کنارے پر قدم دھرتی جا رہی تھی۔ وہی ریت جس پر خدا جانے وہ کتنی بار چل چکی تھی۔ ہاں یہیں پر اس کا بچپن تھا، اس کی جوانی اور خوشی کے لمبے اور اس کا پہلا محبوب۔ یہیں پر، ریت کے ہر ذرے میں۔

دوپہر کا سورج دریا کے عین اوپر چمک رہا تھا۔ وہ وہیں رک گئی اور خراماں خراماں  
 پہنے والے دریا کو دیکھتے ہوئے اپنی نونیزی کے زمانے کی یادیں تازہ کرنے لگی۔ وہ یہاں  
 انڈوں کی شکل کے چھوٹے پتھر تلاش کرنے آیا کرتی تھی۔ یہ دس برس پہلے کی بات ہے۔ جس شام  
 سکول ماسٹر کو معلوم ہوا کہ اس نے گاؤں چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا  
 دریا کے کنارے تقریباً بیہوش ہو کر گرنے کو تھا۔۔۔۔۔ کیا اس کے ساتھ ایسا سلوک ظالمانہ نہیں  
 تھا؟

’کیا وہ اب بھی مجھ سے نفرت کرتا ہے؟ اس نے اپنے آپ سے بڑی سنجیدگی سے  
 سوال کیا۔ ہو سکتا ہے اب کبھی وہ مجھ سے اتنی محبت نہ کر سکے جتنی کیا کرتا تھا۔  
 وہ وہیں رک جانا چاہتی تھی۔ وہ وہاں سے آگے نہیں بڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن مجبوری یہ  
 تھی کہ آگ اگلتا سورج اس کی گردن کی نازک جلد کو جلا رہا تھا۔

وہاں سے وہ مرکزی سڑک کی طرف لوٹ آئی لیکن اپنے گھر کی جانب چلنے کی بجائے  
 وہ چینی مندر کی طرف مڑ گئی۔ وہاں وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ پرانی عمارت میں مختلف سازوں  
 کی ناموں کی تختیاں اب بھی لگی ہوئی تھیں۔ لیکن اندر خاموشی تھی۔ وہاں ایک بھی بچہ دکھائی نہیں  
 دے رہا تھا۔ تو کیا کلاس کا وقت ختم ہو چکا ہے؟ اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نگاہ ڈالی۔  
 ابھی صرف سوا بارہ بجے تھے اور وہ جانتی تھی کہ دوپہر کے وقت بھی ایک کلاس لگتی ہے۔ کہیں سکول  
 ہمیشہ کے لیے تو بند نہیں ہو گیا!

پرائمری سکول کے سامنے ڈراموں کے لیے ایک سٹیج بنی ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس  
 کے بچپن کے دنوں میں یہ مندر خاصا مالدار تھا اور تہواروں کے موقعے پر سال میں کم از کم دو بار  
 یہاں خوب جشن منایا جاتا تھا اور ہر بار سنگاپور سے ڈراما دکھانے والے آیا کرتے تھے جو اپن  
 ایر میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ سارے قصبے کے لیے یہ ایک میلہ ہوا کرتا تھا اور  
 وہ ضد کر کیا اپنی خالہ کے ہمراہ یہاں آیا کرتی تھی۔ اب وہاں کوئی سٹیج نہ تھی اور اس کی جگہ ایک دو  
 منزلہ دکان نے لے لی تھی۔ پرائمری سکول کے عین سامنے ایک کافی بارتھی۔ وہ بہت تھک چکی تھی  
 اور اسے پیاس لگ رہی تھی چنانچہ وہ بار کے اندر چلی گئی اور ایک بغیر کریم کی کافی کا آرڈر دے  
 دیا۔ ایک بوڑھا بیرا خاموشی سے سر جھکائے آیا اور کافی کا ایک پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔  
 ’’آج کیا دن ہے؟ سکول کیوں نہیں کھلا؟‘‘ اس نے بیرے سے دریافت کیا۔



ژانگ جی  
(چین)

## کیسے بتائیں جیون!

1176 نمبر کی بس پر ایک نئی کنڈکٹری تھی۔ ایک ڈبلی اور نازک سی لڑکی جو آسانی سے ٹوٹ جانے والے کانچ کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ بڑی آسانی سے اُس پر ”احتیاط سے ہاتھ لگائیے“ کا لیبل لگا یا جاسکتا تھا۔ ہر مرتبہ جب وہ ہجوم میں سے نکلتی دھکیلتی راستہ بناتی، شی یا نان کو یہی فکر ستاتی کہ وہ ٹوٹ جائے گی اور اُس کے کلڑے کلڑے ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس وہ ہوان یہ سوچتا کہ آخر ایک اور ٹکٹ بیچ کر وہ کیا کر لے گی؟ چند نکلے بس کمپنی کو بنا سکتے ہیں نہ برباد کر سکتے ہیں۔ وہ ٹکٹ فروخت کرنے کے معاملے میں اتنا تردد کیوں کرتی ہے؟

اُس کے ہونٹ قدرے اُوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور لگتا تھا وہ ہمیشہ مسکراتی رہتی، ہے۔ اُس کی گہری اور اثر انگیز آنکھیں، جو اُس کے ڈبلے اور زرد چہرے پر تھیں، اپنے سامنے کھڑے شخص یا شے پر کبھی نہ ہوتیں۔ اس کی بجائے وہ ادھر ادھر بھٹکتی رہتیں۔ کبھی یہاں کبھی کہیں دُور اور لوگ یہ تاثر لیتے کہ وہ گہری سوچ میں غرق ہے یا خواب میں گم ہے۔

لیکن جب وہ گہری سوچ والی خوابیدہ سی آنکھیں آپ پر مرکوز ہوتیں اور وہ بڑی نرمی سے پوچھتی: آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ آپ کو ٹکٹ چاہیے تو لامحالہ آپ کو وہ آداب یاد آجاتے جو کسی زمانے میں سکھائے جاتے تھے اور اب اُن کا سراغ تک نہیں ملتا۔ بارش ہو رہی ہو یا دھوپ چمک رہی ہو، وہ اپنا کام پوری لگن سے کرتی تھی: ٹکٹ فروخت کرتے ہوئے یا بس سے باہر کھڑے ہو کر اپنے نازک بازوؤں سے مسافروں کو اندر آنے میں مدد دیتے ہوئے

-----

لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کی جسمانی قوت اُس سخت کام کے لیے ناکافی ہے۔ آغا زبہاراں میں، جب ابھی روٹی دارکوٹ پہننے جاتے ہیں، اُس کی پیاری سی ناک پر پسینے کے قطرے چمکتے۔ اُس کے بال باغی ہو کر اُس کے کلپ سے باہر نکل آتے اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اس طرح لہراتے کہ اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ چونکہ مسافر تمام کے تمام اجنبی ہوتے تھے اس لیے چپکے بیٹھے رہتے ورنہ کوئی نہ کوئی شخص اُس کی آوارہ لٹ کو ضرور سلجھا دیتا۔

نوجوان لڑکے اس کی موجودگی میں بے چینی محسوس کرتے۔ صرف وہ ہوان پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ فقرے بازی کرتا رہتا۔ مثلاً پچھلے دروازے سے چڑھ آنے والے ایک لڑکے کے بارے میں اُس نے کہا کہ ذرا اس لفظ کو دیکھو، اس نے اپنا سوٹ کمیشن شاپ سے لیا ہے۔

اُس کے دوستوں کا خیال تھا یہ بہت پُر لطف بات ہے۔ اس کے علاوہ وہ وہ ہوان کے شکر گزار بھی ہوتے کہ اُس نے انہیں اس بے چینی سے نجات دلادی تھی، چاہے عارضی طور پر ہی سہی۔

شی یا نان نے اُس کی جانب دیکھا۔ اُس نے وہ ہوان کا کہا ہوا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا اور وہ ٹکٹ اور ریزگاری واپس کرنے میں مشغول تھی۔ اُس نے نالون کے دستانے خاصے استعمال شدہ تھے۔ سلائی میں ایک سُورخ بھی تھا جس میں سے ایک نازک انگوٹھا اور انگلی نظر آتے تھے۔

اگر شی یا نان دائیں جانب دیکھتا تو وہ ہوان بھی اُسے چوری چھپے دیکھ سکتا تھا۔ فیکٹری میں کام کرنے والے نوجوان مزدوروں کا اپنا ایک 'گروہ' تھا۔ زندگی کے قدرتی بہاؤ کے نتیجے میں ایسے گروہ آپ ہی آپ بن جاتے ہیں۔ شی یا نان کا گروہ لفٹوں کا گروہ تو ہرگز نہیں تھا۔ وہ لڑکیوں کو دیکھ کر بیٹیاں بجانا معیوب سمجھتے تھے۔ انہیں چھیڑنا اور آوازیں کسنا اُن کے نزدیک بُری بات تھی۔ شی یا نان اور اُس کا گروہ واہیات قسم کے کپڑے پہن کر بھی نہیں گھومتے تھے۔ وہ بد معاشوں کی نسبت زیادہ تہذیبیت یافتہ واقع ہوئے تھے۔

وہ ہوان کی طرح کتنے لوگ ہوں گے جو سپوزا کی کتاب لیے پھرتے ہوں؟ یہ بھی نہیں کہ ہر کسی کو یقینی طور پر علم ہو کہ وہ یہ کتاب کیوں پڑھ رہا ہے۔ دراصل اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کتاب بہت عالمانہ اور کچھ غیر واضح تھی اس لیے لوگ یہی خیال کرتے تھے کہ وہ نہایت اعلیٰ ذوق اور گہری سوچ کا حامل شخص ہے۔ وہ ہوان ایک ایسا شخص تھا جس پر دنیا ادھر سے ادھر ہو



”محبت نامہ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے تمہاری محبوبہ کے بارے میں علم نہ ہو؟“  
 شی یانان نے ایسی مسکراہٹ اپنے چہرے پر پھیلا لی جس میں اقرار تھا نہ انکار۔  
 بہتر ہے وہ اس خط کو محبت نامہ سمجھتا رہے، بجائے اس کے کہ اُسے یہ معلوم ہو کہ  
 دراصل یہ کیا ہے۔ اگر وہ ہوان کو پتا چل گیا کہ وہ چوری چھپے نظمیوں لکھتا ہے تو وہ سب اُس کا مذاق  
 اُڑائیں گے۔

شی یانان نے خط نکالنے سے پیشتر اطمینان کر لیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ وہ لفافے  
 پر دکھائی دینے والے پختہ طرز تحریر کو دیکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر وہ شے، جس کے لیے وہ اس  
 لکھنے والے کی پرستش کرتا تھا، اُس کے سامنے ہے۔ وہ خوش بھی تھا اور کچھ بدحواس بھی تھا۔ اُس  
 نے ایک جریدے میں اس شاعر کی چند نظمیں پڑھی تھیں۔ یہ نظمیں تازہ ہوا کے ایک جھومکے کی  
 طرح تھیں جس نے اُس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ دل کے تار ٹوٹ  
 جاتے اُس نے فوراً اپنے خیالات کے اظہار کے طور پر ایک خط لکھ کر شاعر کو روانہ کر دیا۔ اُس  
 کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُس کے جذباتی سے خط کا اتنا دوستانہ جواب آئے گا۔ لکھا تھا اسے  
 جب بھی وقت ملے وہ آجائے اور شاعری کے بارے میں گفتگو کر لے۔ اس خیال سے اُسے  
 وحشت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے اپنی شاعری اُس صاحب فن شاعر کی خدمت میں پیش کرے گا۔ یہ  
 ایسے تھا جیسے آپ برہنہ حالت میں پکڑے جائیں۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی جرأت کر سکے گا۔  
 ایک دم یوں لگا جیسے بس میں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں رہی۔ ایک بوڑھی عورت  
 خیدان مارکیٹ تک کا ٹکٹ خریدنا چاہتی تھی۔ ٹکٹ بیچنے والی حساب لگا رہی تھی کہ کتنے کا ٹکٹ ہوگا  
 کہ ایک لوفرنے یکدم کہا: ”دس سینٹ۔“

ٹکٹ خریدنے والوں کے ہجوم میں ٹکٹ فروخت کرنے والی ٹھیک طرح سے سوچ نہ  
 سکتی تھی اور وہ دس سینٹ کا ٹکٹ کاٹنے کو تھی کہ وہ ہوان نے سرگوشی کی: ”صرف پانچ سینٹ بنتے  
 ہیں، دس نہیں“ اُس نے آنکھیں جھپکائیں اور شرما گئی۔ اُس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا:  
 ”یہاں اتنا رٹا ہے کہ میں غلط ٹکٹ دینے والی تھی۔“ اُس نے وہ ہوان کی جانب تشکر نظروں  
 سے دیکھا اور اُس کے ہونٹ کونوں سے اور اُوپر اُٹھ گئے۔

وہ بدتمیز لڑکا بے حیائی سے مسکرانے لگا۔ وہ ہوان اُس کی طرف بھاگا۔ اُس نے  
 وہ ہوان کا کھلاڑیوں جیسا مضبوط جسم اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو یک دم اپنی مسکراہٹ پی گیا۔



شی یا نان و دوہوان کو پسند کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہر شے وہ اتنی آسانی سے کر لیتا تھا، یہاں تک کہ ایک لڑکی کو اپنی طرف مائل کر لینا بھی اُس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔  
اب دوہوان بڑے ٹھہرے ہوئے اور ذرا دکھاوے کے انداز میں کیوں مسکرائے جارہا تھا؟ لگتا تھا دوہوان کو ہمیشہ اپنے مرتبے کا احساس رہتا تھا۔ اُس کی مربیانہ مسکراہٹ کی وجہ سے شی یا نان گرفتہ خاطر ہو گیا۔

گٹک بیچنے والی آہستہ آہستہ اُن کو بہتر طریقے سے جاننے لگی تھی۔ اگر اُن میں سے کوئی ایک موجود نہ ہوتا تو وہ زبان سے کچھ نہ کہتی لیکن اُس کی آنکھوں میں فکر مندی ہوتی۔ لگتا تھا وہ پوچھ رہی ہے: ”وہ چڑے کی جیکٹ والا کہاں ہے؟ کیا وہ بیمار ہے؟“ لیکن جب گٹک چیک کرنے کا مرحلہ آتا تو وہ کوئی رعایت نہ کرتی۔ پھر وہ ہمیشہ کی طرح اکھڑ جاتی۔ دوہوان نے اُس کے اس رویے کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ وہ کبھی بھی اُسے اپنا ماہانہ پاس فوراً نہ دکھاتا بلکہ انتظار کرتا کہ وہ کہے کہ ”کا میڈ آپ کا گٹک؟“ تب وہ بیزارگی کے ساتھ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا اور پاس دکھا دیتا۔ کبھی کبھار وہ اُسے اپنی ملازمت کا کارڈ دکھا کر دھوکہ دینا چاہتا یا اپنے بڑے کوفضا میں لہرا دیتا۔ بہر حال وہ اسے چکر دیتا رہتا اور کافی دیر کے بعد پاس دکھاتا۔  
جب دوہوان خوشگوار موڈ میں ہوتا تو کسی برگزیدہ ہستی کی طرح ہو جاتا۔ وہ بس پرامن و امان قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا۔ پیسے دوسروں سے لے کر اُسے پہنچاتا اور گٹک مسافروں کو تھماتا اور دھیان رکھتا کہ کوئی مسافر بلا گٹک نہ اتر جائے۔ وہ یہ سب کچھ اتنے فطری طریقے سے کرتا کہ وہ لڑکے، جو اپنے مردانہ وقار کو آڑ بنائے اُس کی مدد کرنے سے ہچکچاتے تھے، بے حد شرمندہ ہوتے۔ شی یا نان کے لیے یہ پروقار اور شاندار رویہ ایک کھیل کی حیثیت رکھتا تھا، ایک خاکہ، جو ڈراما سکول کے چند طالب علموں نے پیش کیا ہو۔

صرف اُس کی بس پر سواری کرنے کے لیے دوہوان، جو روزانہ دیر سے جاتا تھا، اب صبح سویرے بیدار ہو کر بس سٹاپ پر چلا جاتا۔ کام کے بعد وہ حسب سابق فوراً گھر نہیں چلا جاتا تھا بلکہ تیز ہوا میں کھڑا رہتا تھا اور بے شمار بسیں آ کر چلیں جاتیں لیکن وہ صرف بس نمبر 1176 پر ہی سوار ہوتا۔ گروہ کے باقی لڑکوں نے اُسے چھیڑنا شروع کر دیا۔ سب کا یہی خیال ہے کہ دوہوان بُری طرح عشق میں مبتلا ہو چکا ہے اور دوسرے لوگوں کی طرح عشق کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ لیکن شی یا نان ان باتوں سے زیادہ خوش نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ ایک نامعلوم

سی نفرت محسوس کرتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک نفیس اخلاق کی مالک خاتون کی شہرت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

وہ ہوان نے ہنستے ہوئے اُس سے دریافت کیا کہ آخر بات کیا ہے؟ مسئلہ کیا ہے؟

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم آخر اُس سے کیا چاہتے ہو؟“

”کیا مطلب کہ میں اُس سے کیا چاہتا ہوں؟“ اور پھر جیسے ایک بچے کو چھیڑتے ہیں

اُس نے پوچھا! ”تم کیا چاہتے ہو کہ میں اُس سے کیا چاہوں؟“

شی یانان کو وہ موسم گرما یاد آیا جب اُس کا باپ اُسے چھٹیوں کے دوران ساحل سمندر پر لے گیا تھا۔ سمندر کے مدوجز میں ایک خوبصورت شیل مچھلی بار بار ساحل پر آ رہی تھی۔ وہ شاید اس خیال میں تھی کہ ساحل پر آ کر بار بار سمندر میں لوٹ جائے گی لیکن ایک بار وہ وہ واپس نہ جاسکی اور اُسے ایک کھلنڈے سے بچے شی یانان نے اُٹھالیا۔ سمندر کے پانیوں سے باہر خوبصورت شیل مچھلی زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی۔ اُس کی خوبصورت زندگی کو تلف کر دینے کا احساس زندگی بھر اُسے ستاتا رہتا۔ شی یانان شاید ساری عمر اس احساسِ جرم میں مبتلا رہتا اگر ایک حادثہ اُسے اس سے نجات نہ دلا دیتا۔

جونہی شی یانان عجائب گھر میں ایک تصویر کو بہتر طریقے سے دیکھنے کے لیے دو قدم پیچھے

ہٹا ایک نوجوان لڑکی درمیان میں حائل ہو گئی۔ اُس نے ایک جانب ہو کر تصویر کو ایک نئے

زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر اُس نے لڑکی کا چہرہ دیکھا اور اُسے پہچان لیا۔ وہ کٹ پیچنے

والی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں چوری چھپے اس کا پیچھا کرنے لگا اور ساری دوپہر اُس

کے پیچھے پھرتا رہا۔ وہ سادہ کھیتوں اور چراگا ہوں کے زمینی مناظر پسند کرتی تھی۔ کھیت ایک

چاندی ایسے چاند تلے، چھوٹے چھوٹے پھڑے گھنے درختوں کے سایے میں گھاس چرتے ہوئے،

بید مجنوں دریا کی سطح کو چھوتے ہوئے، بارش سے دھویا ہوا آسمان جہاں ہلکی ہوا میں زرد پھولوں

کی پتیاں اُڑتی ہیں۔ یہ رنگین تصاویر اُسے ایک ناقابل بیان مسرت سے ہمکنار کر رہی تھیں۔ اُس

کے چہرے کا یہ تاثر ایک اور خوبصورت تصویر بنانے کے لیے کافی تھا۔۔۔۔۔ اور کسی اور شے

کی موجودگی اس تصویر کو خراب نہیں کر سکتی تھی چاہے وہ وہ ہوان ہی کیوں نہ ہو۔

جب وہ چلی گئی تو شی یانان نے اُن تصاویر کو غور سے دیکھا جو اُسے بے پناہ پسند آئی

تھی۔ ایک معمولی کٹ پیچنے والی سے اس طرح کے خوبصورت ذوق کی بھلا کون اُمید رکھ سکتا تھا۔

اُس نے اس کے ہر صبح بس میں سوار ہونے کے بارے میں سوچا جب کہ وہ ابھی اپنے غریبانہ ناشتے کا آخری ٹکڑا چب رہی ہوتی تھی۔ وہ اکثر دیکھتا کہ وہ ہوان اُس کی جانب بہت ترحم آمیز مسکراہٹ سے دیکھ رہا ہے۔ اُس مسکراہٹ سے وہ اندازہ لگاتا کہ شاید وہ ہوان نے ڈبل روٹی اور کھن اور چاکلیٹ اور دودھ کا ناشتہ کیا ہے۔۔۔۔۔ کیا یہ ناشتہ ٹکٹ بیچنے والی کے ناشتے کی نسبت زیادہ شریفانہ اور شاہانہ تھا؟

وہ ہوان ساری دوپہر عجیب سا محسوس کرتا رہا کیونکہ اُس کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ اُس کے پیغام کے بارے میں کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کرے گی۔ کیا زندگی کی شاہراہ پر اسے ہمیشہ سے سبز بتی روشن نہیں ملتی رہی؟

اُس نے شی یا نان کے اُس بیوقوفانہ سوال کے بارے میں سوچا جو اس نے کبھی کیا تھا۔ ”تم۔۔۔ آخراً اس سے کیا چاہتے ہو!“ تو کیا ہے؟ اگر وہ کہہ دیتا کہ اسے اس سے محبت ہے تو دراصل یہ صحیح نہ ہوتا کیوں کہ وہ اسے فتح کرنے کی ایک ناقابل برداشت خواہش رکھتا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیوں کرتی تھی جیسا وہ دوسروں کے ساتھ کرتی تھی؟ وہ ہمیشہ اتنی مؤذنب، مہربان اور شفیق کیوں تھی کہ لوگوں کی بس میں چڑھنے اور اترنے میں مدد کرتی تھی، اُس اپناچ لڑکے کے لیے ہمیشہ ایک نشست کا بندوبست کرتی تھی جو امیروں کی گلی سے بس میں سوار ہوتا اور جیدان مارکیٹ اتر جاتا تھا۔ اُس نے پہلے دن سے ہی یہ کیوں نہیں جان لیا کہ میں اُسے اپنی جانب ملتفت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیا یہ طے نہیں تھا کہ زندگی اسے دوسرے کی نسبت زیادہ سہولتیں مہیا کرنے کے لیے تھی!

جونہی وہ بس سے اترے وہ ہوان نے شی یا نان سے یہ کہہ کر چھٹکارا کر لیا: ”تم پہلے چلے جاؤ، میرا خیال ہے کہ کل میں اپنی کتاب بس میں ہی بھول آیا ہوں۔“ میں ذرا اُسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔“ جونہی اُس نے شی یا نان کو دوسری بس میں سوار ہوتے دیکھا وہ ہوان بھاگ کر پھر 1176 نمبر بس میں سوار ہو گیا۔ ٹکٹ بیچنے والی بس کی صفائی میں مشغول تھی۔

اُس نے سر اٹھایا تو وہ ہوان کی جلتی ہوئی آنکھوں کو گھورتے پایا۔

”تم نے کل بس میں میری کتاب تو نہیں دیکھی؟“

”کون سی کتاب؟“ اُس نے بڑے کاروباری لہجے میں کہا۔ لگتا تھا کہ اُس نے اپنے





ٹکٹ بیچنے والی کا لہجہ اب قدرے سنجیدہ ہو گیا: ”پھر تمہیں ایک عدد ٹکٹ خریدنا ہو

گا۔“

”کتنے پیسے؟“

”پچاس سینٹ“ اُسے دو ہوان کو بڑمانہ کرنا پڑا کیوں کہ وہ اصرار کر رہا تھا کہ اُس کے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ دو ہوان نے اپنی جیبیں ٹٹول کر سکوں کی ایک ٹٹھی باہر نکالی۔ یہ سب کچھ اُس نے ایک منسوبے کے تحت کیا تھا۔

وہ اُن سب سکوں کو نہ پکڑ سکی۔ یہ واضح نہیں تھا کہ جان بوجھ کر ایسا کیا گیا تھا یا نہیں لیکن سکے زمین پر بکھر گئے۔

شی یا نان نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مارنے کی خواہش محسوس کی۔ وہ چاہتا تھا کہ دو ہوان کو گردن سے دیوچ کر اُسے زمین پر پڑے سکے اٹھانے پر مجبور کر دے۔

ایک بوڑھا شخص موٹے شیشوں کی عینک لگائے چھڑی کے سہارے اُدھر آیا۔ وہ دو ہوان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور جیسے کوئی سائنسی مقالہ پڑھا جاتا ہے، کہنے لگا: ”نو جوان مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ اس لیے کہ تمہارا دل اتنا خوبصورت نہیں جتنا تمہارا چہرہ۔“

اب اُس کا وہ خوبصورت چہرہ متغیر ہو گیا۔ اُس کی نسیم پھلکنے لگیں اور اُس پر ایک نفرت انگیز مسکراہٹ چھا گئی۔ اُس نے ٹکٹ بیچنے والی کو بڑی محنت سے ایک ایک سکے کو گنتے دیکھا جیسے گزشتہ زمانے میں مخیر حضرات غریبوں کو خیرات دیا کرتے تھے۔

شی یا نان نہیں جانتا تھا کہ دو ہوان نے یہ بد اخلاقی کہاں سے سیکھی ہے لیکن وہ خود کو بیچ محسوس کر رہا تھا۔ اس ڈرامے نے اسے ٹکٹ بیچنے والی کے لیے تعظیم کے جذبات سے بھر دیا تھا۔ اگر اس کی ملازمت کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز اس طرح اپنی بے عزتی نہ کرواتی۔ ٹکٹ بیچنے والی نے سکوں کے ڈھیر پر سے سر اٹھایا: ”تم نے مجھے سات سینٹ زیادہ دے دیے ہیں۔“ اور اُس نے بقیہ سکے اُس کی طرف بڑھا دیے۔

”مجھے یہ رقم نہیں چاہیے۔“

”یہ تمہاری اپنی مرضی ہے۔“ اُس نے سکے فٹ پاتھ پر رکھے اور بس میں چلی گئی۔ اُس نے یہ بہت کچھ منسوبہ بندی کے تحت کیا تھا لیکن وہ اس منسوبے کی کامیابی پر کوئی خوشی یا اطمینان محسوس نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا سارا بدن سر سے پاؤں تک ٹھونڈ گیا



وہ ساری قوت، جسے وہ اپنی مٹھی میں بھر کر استعمال کرنا چاہتا تھا، اچانک ایک لفظ میں سما گئی تھی۔  
 ”قابل نفرت!“ پھر اس نے آنا فائبر ڈپو کے لیے رخصت چاہی۔ وہ ٹکٹ بیچنے  
 والی کو کچھ بتانا چاہتا تھا۔ کیا بتانا چاہتا تھا؟ یہ وہ بھی نہیں جانتا تھا!  
 دوہوان اس سے پیشتر کبھی یہ کہہ چکا تھا: ”عورتیں نازک مخلوق ہیں، خوبصورت  
 عورتیں کچھ زیادہ ہی نازک ہوتی ہیں۔“

شی یانان نے اُسے دوسری شفٹ کے لیے خالی بس میں بیٹھے دیکھا۔ شفق کی روشنی میں  
 اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ رور ہی ہے بلکہ اُس نے تو چند سسکیاں بھی سُنیں۔ اگر  
 وہ اس بات سے خوفزدہ نہ ہوتا کہ وہ اُسے ایک ایسا لنگا سمجھ لے گی جو صورت حال سے فائدہ  
 اٹھانا چاہتا ہے تو وہ اُس کے آنسو پونچھ کر کہتا: ”اس دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ٹکٹ بیچنے  
 والے معمولی لیکن عظیم پیشے کی عزت کرتے ہیں۔“

ایک بس خاموشی سے پاس سے گزر گئی۔ اس بس کی روشنی میں شی یانان اُس کا چہرہ  
 باسانی دیکھ سکتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ رونہیں رہی تھی بلکہ وہ اپنے خوابوں میں گم تھی۔ اُس کے  
 چہرے کا تاثر بتاتا تھا کہ اُس کے پیچھے سوچ کی ایک ایسی لوی ہے جو کسی خوبصورت اور دور افتادہ  
 مقام تک جاتی ہے۔ اُس لمبے شی یانان سب کچھ سمجھ گیا۔ پختہ عزم اور ذاتی ارادہ کا انھما سراسر  
 انسان کے اندرونی امن پر ہوتا ہے۔ یہ ٹکٹ بیچنے والی نہیں تھی جو کہ نازک تھی بلکہ نازک تو وہاں  
 تھا۔۔۔۔۔ اور شاید وہ خود بھی۔۔۔۔۔ وہ خاموشی سے واپس مڑ گیا۔

وہ بلا مقصد بارش میں گھومتا رہا۔ سفیدے کے سفید اور چوڑے پتوں پر پڑنے والے  
 بارش کے قطروں کی آواز سننا رہا۔ اُس نے سوچا کہ لوگ کتنے مختلف ہوتے ہیں۔ اور کس طرح  
 مختلف لوگوں کو مختلف چیزیں زندگی میں پیش آتی ہیں۔ یکنفٹ اُس کے سینے میں اس سوچ میں کسی  
 اور کو شریک کرنے کی خواہش اُلٹنے لگی۔ بالآخر اسے یہ خیال آیا کہ اس میں اس خوبصورت شاعر کو  
 شریک کیا جاسکتا ہے!

اتوار کے پچھلے پہر شی یانان عام قسم کے گھروں کی قطار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ  
 اس قسم کے رہائشی علاقوں میں بہت کم آتا تھا۔ یہاں صفائی کے انتظامات بہت ناقص تھے چنانچہ  
 گھروں کے درمیان گنداپانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ چھوٹے لڑکے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چیخ  
 رہے تھے۔





گھر پہنچ کر اُسے احساس ہوا کہ اُس نے کیا حماقت کی تھی۔ اُس کو تو تمام عرصہ علم تھا کہ

وہی شی

یا نان ہے۔ کیا وہ ہوان نے بس کے سفر کے دوران کبھی اُس کے سامنے یہ نام نہیں پکارا تھا؟  
 وہ اب بس نمبر 1176 پر دوبارہ سوار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ  
 کیوں لیکن اُسے یوں لگا جیسے وہ ہوان کے رویے کے لیے وہ بھی مورد الزام ٹھہرتا ہے۔ اس سے  
 کیا فرق پڑتا تھا کہ فیکٹری اُس کے گھر سے بہت دور تھی۔ اُس نے آج کے بعد سے سائیکل پر سفر  
 کرنے کا ارادہ کر لیا تھا! وہ روزانہ بس نمبر 1176 کو پاس سے گزرتے دیکھتا۔ جب بھی وہ  
 بس قریب سے گزرتی وہ اپنے آپ سے کہتا: ”عزیز دوست، اُس وقت تک انتظار کرو جب میں  
 بھی تھوڑا سا تم جیسا ہو جاؤں۔ پھر میں تمہیں ملنے آؤں گا۔ ابھی میں اس کے لیے تیار نہیں۔“



والے فالج کے حملے۔ بالآخر جب پرابھاتی کو اپنی بیوی لے جانے کی دعوت دی گئی تو یوں لگا جیسے یہ ممکن نہ ہو کیوں کہ اُس کا مالک اپنے باورچی خانے میں سے ایک اور پیٹ کو بھرتا پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن جب پرابھاتی نے اُسے بتایا

کہ اُس کی نئی بیوی اپنا بندوبست آپ کر لے گی تو مالک مان گیا۔ شروع شروع میں انگریزوں نے مردوں اور عورتوں سے پردہ کیا۔ ایک آہستہ آہستہ یہ کھسکتا ہوا اُس کے بالوں تک چلا گیا اور ایک کٹر ہندو عورت کے لیے یہی مناسب تھا۔ وہ دیکھنے اور سننے میں بہت پُر لطف تھی۔ جھانچھر میں چھپکتے ہوئے ہزاروں گھنگرے اور اُس کے قبضے میں کھکتی ہوئی گھنٹیاں۔

”انگریز تم نے کیا پہن رکھا ہے؟“

”ایک جھانچھر۔۔۔ کیا یہ پیاری نہیں؟“

”اور تمہارے انگوٹھے میں کیا ہے؟“

”ایک انگوٹھی۔“

”اور تمہارے بازو پر؟“

”ایک بار۔“

”اور جو کچھ تم نے ماتھے پر پہن رکھا ہے اُسے کیا کہتے ہیں؟“

”اس کو کلی بند کہتے ہیں؟“

”تمہاری کمر کے ساتھ آج کچھ نہیں انگریز؟“

”وہ بہت بھاری ہے۔ میں اسے کل پہنوں گی۔ آج ہار بھی نہیں پہنوں گی کیوں کہ

ذرا دیکھو، اس کا کلپ ٹوٹ گیا ہے۔ کل میں شہر جا کر نیا کلپ خرید لوں گی اور اُس کے علاوہ ایک

تھبھی۔ میرے پاس ایک بڑی ساری تھتھی جو میری ساس نے رکھ لی۔“

انگوی کو اپنے چاندی کے زیوروں پر بڑا مان تھا اور وہ بھی اُس کے کس سے دیکھتے

تھے۔ وہ جو کچھ بھی کرتی زیوروں کی شان میں اضافہ ہوتا جاتا۔

زت بدلنے سے موسم بھی گرم ہو گیا تھا۔ انگریز کو بھی اپنے جھونپڑے میں اس کا

احساس ہوا ہوگا، جہاں وہ دن کا زیادہ حصہ گزارتی تھی، اس لیے اب اُس نے بھی باہر ہرنا

شروع کر دیا۔ میرے گھر کے سامنے چند بڑے بڑے نم کے درخت تھے اور اُن کے نیچے ایک

پُرانا کنواں تھا جسے صرف عمارتیں تعمیر کرنے والا کوئی مزدور، اور وہ بھی کبھی کبھار، استعمال کرتا

تھا۔ کنویں کے گرد جو پانی گرتا وہ آس پاس کی ہوا کو ٹھنڈا رکھتا۔ وہ اکثر کنویں پر آرام کرنے کے لیے آ جاتی۔ ”بی بی آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟“ انگوی نے ایک روز، جب کہ میں نیم کے درخت تلے پڑھ رہی تھی، دریافت کیا۔

”کیا تم اسے پڑھنا چاہتی ہو؟“

”میں پڑھ نہیں سکتی۔“

”سیکھنا چاہتی ہو؟“

”نہیں نہیں۔“

”کیوں نہیں؟ اس میں کیا حرج ہے؟“

”عورتوں کے لیے پڑھنا لکھنا گناہ ہے۔“

”اور مردوں کے لیے؟“

”اُن کے لیے یہ گناہ نہیں ہے۔“

”تمہیں یہ فضول باتیں کس نے بتائیں؟“

”مجھے خود پتا ہے۔“

”میں پڑھ رہی ہوں تو گناہ کر رہی ہوں؟“

”شہری عورتوں کے لیے یہ گناہ نہیں ہے، گاؤں کی عورتوں کے لیے ہے۔“ ہم دونوں اس فقرے پر ہنسنے لگیں۔ اُس نے ابھی جو کچھ اُسے بتایا جاتا تھا، اُس کے بارے میں سوال کرنا نہیں سیکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اُسے ان خیالات میں سکون ملتا ہے تو میں خواہ مخواہ کیوں اُن کے بارے میں شک کا اظہار کروں!

اُس کی سیاہ رنگت پر اُس کا بدن حاوی ہو جاتا تھا۔ اُس میں سے لذت کا ایک شدید احساس پھوٹتا رہتا تھا اور ایک ایسا بیٹھا پن جو بار بار جھلکتا رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کا جسم گندھے ہوئے آٹے کی طرح ہوتا ہے۔ کچھ عورتوں کا جسم ڈھیلے آٹے جیسا ہوتا ہے جسے اچھی طرح سے گوندھا نہ گیا ہو۔ اور کچھ کبریٰ طرح چمٹنے والا جیسا کہ اچھی طرح سے گوندھا گیا آٹا ہوتا ہے۔ بہت کم کسی عورت کا جسم ایسا ہوتا ہے جس سے اچھی طرح سے گوندھا ہوا آٹا پکانے والے کے لیے قابلِ فخر۔ انگوری کا جسم ایسا ہی تھا۔ اُس کی لہریں لیتے ہوئے بدن میں لوہے کے پیرنگ ایسی چمکتی تھی۔

میں اپنی آنکھوں سے اُس کے چہرے، بازو، چھاتیوں اور ٹانگوں کو محسوس کرتی اور مجھ میں ایک نیم مدہوشی کی کیفیت جنم لینے لگتی۔ میں نے پرا بھاتی کے بارے میں سوچا: بوڑھا، پستہ قد، ڈھیلے جڑے والا۔ اگر یونانی جیومیٹری دان یوکلڈ اُس کے قد اور ہڈیوں وغیرہ کی ساخت دیکھ لیتا تو فوراً فوت ہو جاتا۔ یک دم مجھے ایک مزاحیہ بات سوجھی۔ انگوری کا آٹا پرا بھاتی ڈھانپے ہوئے تھا۔ وہ اُسے ڈھانپنے والا ایک کپڑا تھا، اُسے بچھنے والا نہیں تھا۔ میرے اندر ایک تہقہ جنم لے رہا تھا لیکن میں نے اُس کا گلا گھونٹ دیا کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ انگوری میرے تہقے کی وجہ جان جائے گی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ جہاں سے وہ آئی ہے وہاں شادیاں کس طرح ہوتی ہیں؟

”لڑکیاں جب پانچ چھ برس کی ہوتی ہیں تو کسی کے پاؤں کی پرستش کرنے لگتی ہیں۔ بس وہی خاوند ہوتا ہے۔“

”اُس کا باپ پیسے اور مہول اُس کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔“

”یعنی باپ کرتا ہے، لڑکی تو نہیں کرتی؟“

”وہ یہ سب کچھ لڑکی کے لیے ہی تو کرتا ہے۔ تو یہ لڑکی ہی ہوئی۔“

”لیکن لڑکی نے تو اُسے پہلے نہیں دیکھا ہوتا۔“

”ہاں، لڑکیاں نہیں دیکھتیں۔“

”کیا ایک بھی لڑکی اپنے ہونے والے خاوند کو نہیں دیکھتی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ ہچکچائی۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد اُس نے کہا۔ ”جو محبت کرتی

ہیں۔۔۔۔۔ وہ دیکھ لیتی ہیں۔“

”کیا تمہارے گاؤں میں بھی لڑکیوں کو محبت ہو جاتی ہے؟“

”ہاں کچھ ایسی ہوتی ہیں۔“

”جو محبت کرتے ہیں وہ گناہ نہیں کرتے؟“ میں نے تعلیم کے بارے میں اُس کے

خیالات یاد رکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ گناہ ہے۔۔۔۔۔ بہت بڑا گناہ۔“ اُس نے جلدی سے کہا۔ ”وہ ایسا نہیں

کرتیں۔۔۔۔۔ ہوتا یہ ہے کہ کوئی مرد لڑکی کو جڑی بوٹی کھلا دیتا ہے اور وہ اُس سے پیار کرنے

لگتی ہے۔“

”کون سی جڑی بوٹی؟“

”جنگلی۔“

”کیا لڑکی کو پتا نہیں چلتا کہ اُسے جڑی بوٹی دی جا رہی ہے؟“

”نہیں وہ اُسے پان میں رکھ کر دے دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ صرف اُس کے ساتھ

رہ کر خوش ہوتی ہے، اپنے مرد کے ساتھ۔ مجھے پتا ہے۔ میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

”تم نے کس کو دیکھا تھا؟“

”ایک سہیلی کو۔۔۔۔۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔“

”کیا ہوا؟“

”وہ پاگل ہو گئی اور اُس کے ساتھ شہر بھاگ گئی۔“

”تم کیسے جانتی ہو کہ یہ سب کچھ اُس بوٹی کے کھانے سے ہوا؟“

”اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ وہ اپنے ماں باپ کو کیوں چھوڑتی؟ وہ اُس کے

لیے شہر سے ڈھیر ساری چیزیں لے کر آیا۔ کپڑے، زیور، مٹھائیاں۔“

”یہ جڑی بوٹی آئی کہاں سے ہے؟“

”مٹھائی میں سے۔۔۔۔۔ ورنہ وہ کس طرح اُس کے ساتھ محبت کر سکتی تھی۔“

”محبت کے تو اور بھی راستے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اور کوئی راستہ نہیں؟“

”نہیں اور کوئی راستہ نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ ماں باپ کو تو ایسی لڑکیوں سے بہت نفرت

ہوتی ہے۔“

”کیا تم نے اُس بوٹی کو دیکھا ہے؟“

”نہیں۔ یہ کسی دور کے ملک سے لائی جاتی ہے۔ میری ماں نے مجھے کسی سے بھی پان یا

مٹھائی لینے سے خبردار کیا تھا۔ مردان میں بوٹی ڈال دیتے ہیں۔“

”تم تو بہت سیانی تھیں لیکن تمہاری سہیلی کیسے کھا گئی؟“

”اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے۔“ اُس نے سختی سے کہا اور اگلے لمحے اُس کے

چہرے پر ایک سایہ سا آیا جیسے وہ اپنی سہیلی کو یاد کر رہی ہو۔ ”وہ پاگل ہو گئی۔ وہ بے چاری پاگل

ہو گئی۔“ اُس نے اُداس ہو کر کہا۔ ”کبھی بالوں میں کنگھی نہ کی؟ ساری ساری رات گاتی رہتی

تھی۔“

’’وہ کیا گاتی تھی؟‘‘

’’پتہ نہیں جب وہ بوٹی کھاتی ہیں تو سب گاتی ہیں۔۔۔۔۔ اور روتی بھی ہیں۔‘‘  
یہ گفتگو بہت طویل ہوتی جا رہی تھی اس لیے میں آرام کرنے چلی گئی۔

ایک روز میں نے اُسے نیم کے درختوں کے نیچے گہری سوچ میں گم دیکھا۔ عام طور پر جب انگوری کنویں کی جانب آتی تو اس کی آواز سنائی دے جاتی۔ اُس کی جھانجھرائی کی آمد کا اعلان کر دیتی اُس روز وہ خاموش تھی۔

’’کیا بات ہے انگوری؟‘‘

اُس نے مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھا اور اُس کے بعد سنبھل کر کہنے لگی: ’’مجھے پڑھنا سکھا دو بی بی۔‘‘

’’ہوا کیا ہے؟‘‘

’’مجھے میرا نام لکھنا سکھا دو۔‘‘

’’تم لکھنا کیوں چاہتی ہو؟ خط لکھنے ہیں؟ کس کو؟‘‘

اُس نے جواب نہ دیا اور ایک مرتبہ پھر خیالوں میں گم ہو گئی۔

’’یہ گناہ تو نہیں ہوگا!‘‘ میں نے پوچھا تاکہ وہ اپنی اس کیفیت میں سے باہر آسکے۔

اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں قیلو لے کے لیے اندر چلی گئی۔ شام کو جب میں باہر آئی تو وہ ابھی تک وہیں تھی اور گارہی تھی۔ جب اُس نے میرے قدموں کی آہٹ سنی تو وہ مڑی اور چپ ہو گئی۔ وہ شام کی خنک ہوا کی وجہ سے کندھے جھکائے بیٹھی تھی۔

’’تم تو بہت اچھا گاتی ہوئی انگوری۔‘‘ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش

کر رہی ہے اور پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک زرد مسکراہٹ پھیل گئی۔

’’میں گانا نہیں جانتی۔‘‘

’’لیکن تم تو جانتی ہو انگوری۔‘‘

’’یہ تو وہ والا گانا۔۔۔۔۔۔‘‘

’’وہ گانا جو تمھاری سہیلی گایا کرتی تھی؟‘‘ میں نے فقرہ مکمل کر دیا۔

’’میں نے یہ اُسی سے سنا تھا۔‘‘

’’میرے لیے گاؤ۔‘‘

اُس نے وہ لفظ ادا کرنا شروع کر دیے: ’’یہ وہ وقت ہے جب کچھ بدل جانا چاہیے۔

چار ماہ سردی، چار ماہ گرمی، چار ماہ بارش۔۔۔۔۔۔‘‘





”کیا یہ بوٹی کی وجہ سے ہے؟“

آنسو اُس کے چہرے سے دوندیوں کی طرح بہنے لگے جو اُس کے منہ کے کونوں میں  
پہنچ کر چھوٹے چھوٹے تالابوں کی صورت اختیار کر گئے۔

جینفر کیولے ڈراسکاؤ

(تھائی لینڈ)

## پیار زادہ

گرم موسم میں ملازموں کے کوارٹرائٹن دم گھونٹ دینے والے ہوتے تھے جیسے کہ ساگون سے بنی چائے کی الماریاں لیکن سوپونگ کے لیے اُس کا کمرہ ایک جنت سے کم نہ تھا۔ وہ شمال مشرقی تھائی لینڈ سے بنگاک آئی تھی تاکہ دھان کی کھیتوں کی مشقت کی نسبت بہتر زندگی گزار سکے۔ اور چند ہفتے پیشتر تک وہ اتنی زیادہ مایوس بھی نہیں ہوئی تھی کہ معاملات بگڑنا شروع ہو گئے۔ اُس کے پاس سونے کے لیے ایک چٹائی تھی، جس میں اُس کی بہنوں کی ٹانگیں اور بازو گھس کر اُسے پریشان نہیں کرتے تھے۔ آئینہ بھی اُس کا اپنا تھا۔ چاندی کے خنجر کی شکل کا جو بڑے غسل خانے کے اُس آئینے کا ایک حصہ تھا جو اُس کے ہاتھوں سے پھسل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اُس نے بڑی احتیاط سے یہ ٹکڑے چھپا دیے تھے تاکہ مادام اور راسمی کو علم نہ ہو سکے۔ جس کے بارہ چھوٹے بہن بھائی ہوں وہ چیزوں کو چھپانے میں بڑا ماہر ہو جاتا ہے۔ ابھی اُسے نرم و نازک چیزوں کو اٹھانے اور رکھنے کا سلیقہ نہیں آیا تھا اور وہ اب بھی اُن جھڑکیوں سے خوفزدہ رہتی تھی جو اُس کی نالائق کی بنا پر اُسے پڑتی تھیں۔

سوپونگ نے اپنے عکس کو ستائشی نظروں سے دیکھا حالانکہ وہ ڈراؤنا اور الٹ پلٹ عکس تھا۔ اُس نے اپنی گوری جلد کو ٹکا اور آنکھوں کو ذرائع واکر نے کی کوشش کی جیسا کہ اُس نے تھائی رقاصاؤں اور چینی اداکاروں کو کرتے دیکھا تھا۔ سوپونگ کو گاؤں کے پرانے طریقے چھوڑنے اور ایک بڑے شہر کے اطوار اپنانے کا

بڑا اشتیاق تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جب وہ سراٹھائے، لا پرواہی سے گولے مٹکاتی ہوئی، چمکتے ہوئے ملبوس میں چلتی تھی تو ڈرائیور حضرات کی آنکھیں کیوں اُبل پڑتی تھیں۔ راسمی کے لیے دوڑ بھاگ کے کام کرنے کا صرف ایک ہی فائدہ تھا کہ فٹ ہاتھ کی مخلوق مثلاً چھابڑی والے، بے کار بیٹھے ہوئے لوگ اور نیکی ڈرائیور اُس کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے تھے۔

پُرانے زمانوں میں، جب اُن کی غیر ملکی مادام بِنکاک میں نووارد تھی، سوپونگ ایک ڈائٹن نیکی میں، جس کی سیٹیں شوخ پلاسٹک کی تھیں، پرا تو نام مارکیٹ جایا کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ مادام کے خرچے پر لیکن راسمی نے جلد ہی یہ سلسلہ بند کر دیا۔ راسمی نے سوپونگ کو لاڈ بھی کہا تھا صرف اس لیے کہ اُس نے اُسے سُرخ چیونٹیوں کے انڈے کھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سوپونگ کو کیسے پتا چلتا کہ بِنکاک کے رہنے والے ایسی چیزیں نہیں کھاتے؟

وہ کھاتے تھے اور بہت اچھا کھاتے تھے۔ کھانا پکنے کی خوشبو اور تیل کڑکڑانے کی سُوں سُوں آتی ہی رہتی تھی۔ راسمی اس وقت باہر کولوں پر ٹھکی ہوئی تھی اور ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ تلے ہوئے چاولوں اور مچھلی کی چٹنی کی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔

”مچھلی کی خوشبو کے کیا کہنے!“ سوپونگ کمرے سے باہر چلی آئی۔ اور اپنے پیچھے مچھردانی کو گراتی آئی۔ مچھردانی کے سوراخوں میں اُس نے کپڑے کے جوکڑے گھسیڑ رکھے تھے وہ چھوٹے چھوٹے جھنڈوں کی طرح اُڑے۔ سوپونگ نے راسمی کو خوش کرنے کے لیے اس کی جانب اپنی بہترین مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ ایک ایسی مسکراہٹ جسے دیکھ کر غیر ملکی سپاہی اُسے سیامی بلی کہتے تھے۔ اس کی مسکراہٹ نے بوڑھی باورچن پر اس کی بھوک کا پول کھول دیا تھا اور راسمی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”تمہارا کھانا کہاں ہے؟“ راسمی نے فراتے ہوئے کہا۔ ”شاید تم اپنے لیے چاول زیادہ خریدنا پھر بھول گئی ہو۔ بہت بھاری ہوں گے نا جو تم سے اُٹھ نہیں سکتے تھے؟ انھیں لانے کے لیے تمہیں نیکی چاہیے تھی؟ کاہل، اونہہ!“

”ہائے میری ماں، یہ کسی کو کچھ بھی بھلا نے نہیں دیتی! مارکیٹ سے چکو ترے ڈھوتے ڈھوتے میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔“ سوپونگ نے آہ وزاری کی۔ ”یہ جو میم ہے یہ چکو ترے ہی کیوں کھاتی ہے؟ شاید نازنگیاں اتنی اچھی نہیں ہوتیں!“

راسمی نے سکواڈ کا ڈھانچہ گھمایا جیسے چڑے کا سُکھا ہوا دستا نہ بانس کی سوئی پر گھومتا

ہے۔

”تمہاری عمر میں“، اُس نے کہا، ”میں آدھا تیل کندھوں پر اٹھالیتی تھی اور کسی نے کبھی میرے منہ سے شکایت کا ایک لفظ نہیں سنا۔ ہاں، میں کام کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ چچا“، اُس نے سوپوونگ کی معذرت طلب آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پکے ہوئے سکوڈ مالی کو دے دیے جو سوپوونگ کی طرف دیکھتا ہوا اور اسے چڑانے کے لیے انھیں اپنے بے دانت مسوڑھوں سے پُر شورانداز میں چوسنے لگا۔

”راسمی، تم تو اب بھی ایسی ہو کہ ایک تیل اٹھا سکو۔“ سوپوونگ نے ملائیم لہجے میں کہا۔ اُس نے اپنے ذہن میں ایک خیالی سوار کا اضافہ بھی کر لیا تھا۔ ”اپنے کام سے غرض رکھو، بس، تھتھلاتے بڑھے قلی!“ یہ تھا صحیح۔ راسمی خاص طور پر کام کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ چوڑی چکلی اور پُر سکت۔ اس کے بال حیرت انگیز حد تک پھلدار تھے جیسے ایک نایاب پھول جو گھن لگے پرانے درخت پر لگا ہو۔ وہ اپنے بالوں کو تختی سے اپنی چھوٹی گردن پر بے غورے میں دبا دیتی۔ راسمی کو خوشبوؤں اور شوخ رنگوں سے نفرت تھی۔ اُس کی ساری انا کا مرکز اُس کی غیر متزلزل بنیادی اخلاقیات تھی۔ اُس کی جلد سیاہ تھی جو مادام کو پسند نہ تھی۔ مادام سوپوونگ کے گورے شمالی حُسن کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ راسمی اس بات سے خار کھاتی تھی۔ سوپوونگ کا موجود ہونا ہی اسے تاؤ دلانے کے لیے کافی تھا۔

اُس نے سوپوونگ کی طرف دیکھے بنا نیزے سے گھائل ایک سکوڈ پکڑا یا جو ابھی ٹھیک طرح سے نہیں پکا تھا۔ ”اور ذرا جلدی کرو۔“ اُس نے حکم دیا۔ ”آج اتنا کام ہے کہ تین لوگ بھی مشکل سے کر پائیں گے۔ کچھ دوست کھانے پر آ رہے ہیں اور میم صاحب اُن بیکار لوٹنڈوں کو سفارت خانے سے بھی نہیں بلارہی کہ آ کر کھانا ہی لگا دیں۔“

”انسوس۔“ سوپوونگ نے سکوڈ سے بھرے ہوئے مُنہ سے کہا۔ کالی پھلی کی چٹنی اسے بھینسے کے چمڑے کی نسبت تھوڑا سا نرم کر دیتی تھی لیکن بس اتنا ہی۔ راسمی نے ناک چڑھائی۔

”پھلی مرتبہ وہ ساری کی ساری شراب پی گئے تھے اور آخر میں باڑے کے نیچے لیٹ کر گانے گارہے تھے۔“

”اُن میں سے ایک کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔“ سوپوونگ نے کہا۔ ”میم کو چاہیے کہ جب مہمان آئیں تو ہمیں زیادہ تنخواہ دیا کرے کیونکہ کام بھی تو زیادہ ہو جاتا ہے۔“

سو پونگ کو مادام سے بھی تقریباً اتنی ہی نفرت تھی جتنی راسمی سے۔ اُسے مادام کی سفید جلد سے نفرت تھی اور اُن سنہری بالوں سے نفرت تھی جو اتنے خوبصورت لگتے تھے۔ مادام کے پاس تین اور مری ہوئے ماداموں کے گھنگھر یا لے بال تھے جو بید کے ایک ”مراہو اسر“ اپنے بالوں پر رکھ لیتی اور فیشن کی تصویر بن جاتی۔

فرنگی بلا۔ وہ تو اپنی وگوں میں پوشیدہ مہوتوں سے بھی خوفزدہ نہیں تھی۔ سو پونگ کبھی کبھی سوچتی کہ شاید مادام نے اُن فرنگی عورتوں کو قتل کر کے اُن کے بال حاصل کیے ہوں۔ سو پونگ مہوتوں سے خوفزدہ تھی لیکن لڑائی مار کٹائی سے واقف تھی۔ بطوں اور مرغوں کی لڑائی نہیں بلکہ خاندان میں حقیقی قتل سے بھی واقف تھی۔ اُس کی چچی ایک کاشنکاری میں استعمال ہونے والا مٹھرا لے کر اُس کے پچا کی تیسری نوجوان بیوی پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لاش کو گھسیٹ کر لے جاتے اُس نے اُس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ سو پونگ کو ایسے واقعات یاد آتے تو وہ آرام سے مسکراتی رہتی۔ وہ تو جلانے کے لیے پوری لاش بھی نہیں تلاش کر سکے تھے۔ ایک کان پورے ایک ہفتے بعد زوحوں کی درگاہ کے پیچھے سے ملا تھا۔ اب اس میں دو ہی باتیں ممکن تھیں جن پر صرف ہنسا جاسکتا تھا کہ یا تو زوحوں نے کان پڑ لیا تھا یا سو پونگ کے خیال میں اسے ان کی بھینٹ چڑھا یا گیا تھا! بہر حال، جو بھی ہو، اب تو وہ نوجوان بیوی اگلے جنم میں ایک کان کے بغیر ہی آئے گی۔ عموماً سو پونگ کان کئی لاش کے بارے میں سوچ کر بے حد خوش ہوا کرتی تھی لیکن آج اُسے اس بات پر بے حد حیرت ہوئی تھی کہ اس نے برآمدے کے کنارے سے جھک کر نیچے کھلے کنول کے اوپر تے کر دی تھی اور اس کی طبیعت ماندی ہو رہی تھی۔

”گندی“ راسمی نے ناراض ہو کر کہا۔ ”تو میری دی ہوئی اچھی خوراک کا تم یہ حشر کرتی ہو؟ پہاڑی قبیلے کی بکریاں، لاڈ لوگ۔ نہ کھانے کا سلیقہ نہ صاف رہنے کے آداب!“

سو پونگ شرمندہ ہو کر ہنسی۔ وہ جلدی سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی اور اپنے منہ کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کرنے لگی۔ ”میں۔۔۔۔۔ میں جا کر کپڑے دھوتی ہوں۔ میم نیچے آ کر ابھی اپنی گاف کی قمیض کے لیے گھنٹی بجانے لگی گی۔“

راسمی نے اُسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور اُس کی آنکھوں میں گھورتی ہوئی کہنے لگی: تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ سو پونگ نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کے زرد رخسار سُرخ ہو گئے۔ راسمی نے دوسری لڑکی کو چھمردانی میں سے گھسیٹا اور









کسی بچی کو سجا یا سنوارا جاتا ہے نہ یہ کہ خود بن ٹھن کر گڑیا بنی پھرے۔ ’جانی، اس سکرٹ میں تم بیچ نہیں رہی ہو!‘ یہ وقت تھا تخلیقی گھر یلو سرگرمیوں کا۔ ایک ایسے بچے کے ساتھ، جو بہت تیز اور پیارا ہو، سنہری بالوں والا اور گرگیک کی طرح نیلی آنکھوں والا، انگلی کے ساتھ تصویریں اور کاغذ کو کاٹ کر چیزیں بنانے کا۔ بچہ جس کی عمر اور جنس کا پتہ نہ تھا، اپنا پھول سا چہرہ اوپر اٹھائے گا تاکہ اس کی آنکھوں سے پیارا اور علم اور راہنمائی حاصل کر سکے۔ جیسے وہ دھوپ بھی ہو اور برسنے والا بادل بھی۔

مسز فرینکلن برگ نے ایک مچھر کو ہاتھ رسید کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے آپ پر رحم کھانے کے جذبے کا بے رحمی سے گلا گھونٹ دیا۔ کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اڑتیس کی ہے۔ جیسا کہ اس کا خاندان اکثر کہا کرتا تھا: ’جانی، کسی کو خیال بھی نہیں آ سکتا کہ تم تقریباً چالیس کی ہو چکی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارا بدن تو کسی نوخیز لڑکی ایسا ہے۔‘ اور یہ بیچ تھا۔ اُس کے گھنگریالے سنہرے بال تھے اور لو لینا ایسی آگے کو اٹھی ہوئی چھاتیاں جو کسی کنواری کی لگتی تھیں اور اُس کے خاندان کو ایک خوشگوار لذت سے ہمکنار کرتی تھیں کہ کہیں وہ قانون کی گرفت میں نہ آجائے۔ وہ بہ آسانی نوخیز لڑکیوں والے کپڑے پہن سکتی تھی۔ جو اس کے سراپے پر بچتے تھے۔ لیکن وہ اپنے لیے ایسے کپڑے خریدتے تھے آگے تھی۔ پھر ہمیشہ ایک طنز تو موجود رہتا تھا: ’ظاہر ہے بچوں کی پیدائش سے بدن کی بناوٹ خراب ہو جاتی ہے۔ میں تو مانیکل اور ڈیوڈ اور سوزن اور گرانٹ اور آرون سے پیشتر ایک تیر کی طرح تھی لیکن کیرن نے تو میرا ناس مار دیا۔۔۔۔۔‘

مسز فرینکلن برگ نے تیزی سے اپنا ڈھوپ کا چشمہ پہن لیا۔ وہ پھر تیوریاں چڑھا رہی تھی۔ جلد ہی چہرے پر جھریاں ہوں گی اور اگر آپ کا خاندان جو ان اور ایک سنہری کھلاڑی ہو تو جھریوں سے بچنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے گرگیک فرینکلن برگ اتنا عقلمند نہ ہو جتنا خوبصورت تھا لیکن وہ اُس سے محبت کرتی تھی۔ کاش وہ اسے اپنی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کر سکے۔

متنبی بنانے والی سوسائٹی کو انھوں نے دو برس پیشتر درخواست دی تھی اور تب انھیں بتایا گیا تھا کہ اُن کی عمریں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ ہزار بار اُس نے اُس راستے کے بارے میں سوچا تھا جو گرگیک کے ذہن میں تھا۔ آخری موقع، آخری ممکنہ صورت، اس سے پہلے کہ سوسائٹی



اُنھیں فروخت کرتی ہیں اور صرف ایک ہزار روپے میں۔ قسمت ساتھ دے تو صرف بیس ڈالر میں، اگر وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوں تو۔“

”نہیں گریگ، میں اس سلسلے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔“ لیکن دوبارہ وہی موضوع چھڑ جاتا: ”آخر نفسیات دان بھی تو ہمیشہ یہ ثابت کرتے رہے ہیں کہ سازگار ماحول کسی ورثے میں ملے ہوئے برے کردار پر بھی اثر انداز ہو جاتا ہے لیکن کیا تم ایک بھورے بچے کے لیے بھی ویسا ہی محسوس کرو گے جس کی آنکھیں عجیب سی ترچھی ہوں؟ کیا تم ایسا کر سکو گے؟ کیا تم ایسا کر سکو گے؟“

سز فرینکلن برگ کو تھانیوں کی اس عادت سے چڑتھی کہ وہ اُس پر نظریں جمائے ادھر ادھر کھڑے رہتے تھے جب تک کہ وہ اُنھیں بولنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ سوپونگ اُس کے پیچھے پیچھے پھرتی رہتی ہے۔ جب لڑکی کو پتہ چلتا کہ اُسے دیکھ لیا گیا ہے تو وہ فرش پر بیٹھ کر جھک جاتی۔

”کیا ہے؟“ سز فرینکلن برگ جتنی نرمی سے پوچھ سکتی تھی پوچھتی۔ دنیا میں اور کہیں ایسے لوگ نہ تھے جن پر تم اپنا غصہ نکالو پھر پُشت پر تھکی دے دو، ایک پیالی کافی پلا دو تو وہ سب کچھ بھلا دیں گے۔ وہ جلد ہی مسکرانے لگتے لیکن بھولتے نہیں تھے۔ ”مزید ادھار چاہیے یا رشتے داروں کو دیکھنے جانے کے لیے ایک دن کی چھٹی چاہیے؟“

لگتا تھا نوکروں کے رشتے داروں کی قطاریں ہیں جو موت کے دروازے پر کھڑے ہیں اور چاول کی قیمت دن بدن بڑھتی چلی رہی تھی۔

سوپونگ نے سسکیاں بھرتے ہوئے، لفظوں کی بوچھاڑ میں، اپنی رام کہانی سنائی تاکہ مادام پر بہت اثر ہو۔ اُس نے کہانی کا اختتام ایک ماہرانہ تخلیقی انداز میں یہ کہتے ہوئے کیا کہ وہ گھر واپس نہیں جائے گی، اُس کا باپ اُسے مار ڈالے گا۔ اگر وہ بچے کو نہ رکھ سکی تو اپنے آپ کو مار ڈالے گی۔ یہ ایک غیر ملکی بچہ تھا۔ اگر مادام نے مدد نہ کی تو وہ شرم کے مارے مر جائے گی۔ پھر وہ اس کے قدموں میں یوں بھگی گویا فرش چوم رہی ہے۔

کوئی حالت قدم بوسی سے زیادہ ذلیل نہیں۔ یہ بدھ لاماؤں، محترم والدین اور شاہی خاندان کے افراد کے سامنے کی جاتی ہے۔ مکائیں اسے نہایت نفیس طریقے سے پیش کرتی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے پچاس کیمروں کے سامنے، مقدس بتوں کے سامنے اور اجداد کے مقابر کے

سامنے اور پوری قوم اُن کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے اور سراہتی ہے کیونکہ گھٹنوں کے بل چلنا اور خاک میں سانس لینا اچھی بھلی مشقت ہے جب کہ آپ نے بدن سے لپٹا ہوا ایک ساروگنگ بھی پہن رکھا ہو اور جب ایسا کرنے والے کو کوہان بھی کوئی اچھا منظر نہ پیش کر رہا ہو۔ قصہ مختصر، بجائے اس کے کہ آپ ایسا کر رہے ہوں بہتر ہے کوئی اور آپ کے سامنے ایسا کر رہا ہو۔ مسز فرینکلن برگ نے انناس کی پلیٹ اور آدھے لکھے خط کی طرف سوپوگنگ کی کسی ہوئی چھوٹی پشت کے اوپر سے دیکھا اور تیزی سے سوچا: دوغلا۔۔۔۔ ایک دوغلا بچہ۔۔۔۔ لیکن کس کا؟ ایک جواب جھٹ پٹ آ گیا لیکن اُس نے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ جب سوپوگنگ پہلی بار آئی تھی تو گریگ، جو کسی خوبصورت بدن کو سات پردوں میں سے بھی دیکھ لیتا تھا، فوراً اُس کے پہلے خوبصورت چہرے، اُس کے شاندار بالوں کی طرح تھے۔ اور اُس کا سر تو ایسے تھا جیسے نازک ڈنٹھل پر ایک خوبصورت پھول۔ گریگ شاعر تو نہیں تھا لیکن ان میں سے کچھ باتیں اُس نے کبھی تھیں اور بہت ساری باتیں صرف سوچی تھیں اور بار بار، جب وہ ہفتے کے اختتام پر گاف کھیلنے جاتی، گریگ پر کام کا بوجھ پڑتا تو وہ بڑی بے عرضی اور خوش مزاجی سے اُسے خدا حافظ کہہ کر گھر ہی ٹھہرا رہتا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا سلسلہ ہے۔

’یہ بچہ کس کا ہے؟‘ اُس نے تھائی میں سرگوشی کی اور اسی وقت اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر اُس کے چہرے کو اپنی طرف کیا۔ گھلی ہوئی، گھمکتی سیاہ آنکھیں جو اس کی طرف اور شرمندگی سے دیکھ رہی تھیں۔ اُس نے سوچا جیسے اس نے جواب پڑھا ہے۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر چندھیان گئی تھیں لیکن چاند ایسا زرد حسن قائم تھا۔

’نہیں۔‘ مسز فرینکلن برگ نے کہا۔ مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دو۔ تم جاؤ۔

’اچھا مادام۔۔۔۔ شکر یہ مادام۔۔۔۔ شکر یہ‘ سوپوگنگ باورچی خانے میں واپس چلی گئی۔ اُسے اپنا آخری ہتھیارا استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ اس دھمکی کی کہ وہ الماری میں رکھی ساری سپرین کی گولیاں نکل کر خودکشی کر لے گی۔

مسز فرینکلن برگ سُن ہو گئی تھی لیکن وہ ایک غیر معمولی عورت تھی، اپنی ماں کی طرح۔ وہ ایک مثالی بیوی کا کردار ادا کرے گی۔ وہ کبھی اپنے شک کا اظہار نہیں کرے گی اور سب کچھ برداشت کرتے ہوئے بچے کو گود لے لینے کی تجویز پیش کرے گی۔ یہ تہیہ کر کے اُس نے سوپوگنگ کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔



”یہ میری زندگی کا سب سے فائدہ مند تجربہ ہے۔“ اس کی بیوی بولی۔ ”بچے کو

بڑھتے ہوئے دیکھنا، جیسے میں خود اُمید سے ہوں۔“

”اچھی بات یہ ہے کہ ماں کا رنگ اتنا صاف ہے۔ پھر بچہ بھی دوغلا ہے۔ اسے

ہمارے ماحول میں ڈھلتے دیر نہیں لگے گی۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ یعنی جب ہم وطن واپس

جائیں گے۔ میرا خیال ہے تم نے پوری طرح چھان پھنگ کر لی ہوگی کہ بچے کا باپ امریکی ہے؟“

ڈہ ڈرا ہنچکا رہا تھا۔

”ہاں۔“ اُس نے کہا ”مجھے پورا یقین ہے۔“

”کیا میں نے تمہیں بتایا تھا“، اُس نے اپنے گلاس سے مخاطب ہو کر بے جلت کہا، ”میں

اس بات کا پورا اطمینان چاہتا تھا کہ کہیں کوئی اڑچن نہیں ہو لہذا میں سو پیونگ کو اپنے قانونی مشیر

کے پاس لے گیا تھا جہاں اُس سے بچے کو گود لینے کے کاغذات پر اٹھوٹھے لگوائے گئے ہیں۔ اب

معاملہ پکا ہے۔“

”گریگ مجھے خوشی ہے کہ تم نے ایسا کیا۔“ اُس نے کہا۔ ”اخلاقیات ایک عیاشی

ہے، غریب طبقہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے اگر کوئی زیادہ مول لگا تا تو وہ یہ بچہ اسے

بھی دے سکتی تھی۔“

”لہذا اسی خوشی میں ایک جام فرینکن برگ کی کروڑوں کی دولت کے وارث کے

لیے۔۔۔۔۔“ اُس نے مذاق کرتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ اٹھا کر غوطہ خوروں والی گھڑی پر

سے وقت دیکھا۔ ”صبح کے تین بج رہے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا وہ جانے کا نام نہیں لیں گے۔ یکا یک

ہم سب کی توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ وہ چٹپٹی خربیں سننا چاہتے ہیں۔ اس سے تمہارا دماغ نہیں

خراب ہونا چاہیے۔ اور خواہ مخواہ مجھ پر مت چڑھ دوڑنا۔۔۔۔۔ کہیں تمہیں حمل کا دورہ پڑ جائے

اور اپنے نیکیے اپنے لبا دے میں چھپاتی پھرو۔ بہر حال، اے ماں بننے والی خاتون، تمہیں اس

وقت آرام کرنا چاہیے۔“ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ڈہ بیڑھیوں پر چڑھتے گئے۔

بعد میں، تاریکی میں، دو بارہ تنہا، وہ نیم خوابیدہ ذاتی خوابوں سے ہم آغوش ہوتے

رہے۔ ”ہم فرق واضح کریں گے۔“ مشرقی شہزادی کو چیا نگ منڈیرین طرز کے کپڑے پہنائیں

گے۔ ”مسز فرینکن برگ نے سوچا۔“ میں تو اس وقت اُس کو گریجویٹیشن کے موقع پر دیکھ رہی

ہوں۔ کہا جاتا ہے طواں خون رکھنے والے بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ وہ ان طالب علموں میں







تھی۔ لیکن سوپوٹنگ بھی تو نو ماہ ڈنلپ کے نرم تکیوں اور پی ایکس کے دٹامنوں کی وجہ سے ذرا نازک ہو گئی تھی۔ راسمی نے سپینے سے بھیکے ہوئے دونوں سفید چروں کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک اُبلے ہوئے مُرغ کی طرح سفید اور بغیر خون کے لگ رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ ہسپتال تک بھی پہنچتے ہیں یا نہیں۔ اُس نے سوچا۔

مالی سرپٹ دوڑتا ہوا آیا اور پھاٹک کھول دیا اور بیوک ڈھول اُڑاتی نکل گئی۔ انتظار کے لمحے ختم ہو چکے تھے۔ دونوں حاملہ عورتیں، دونوں بری طرح خوفزدہ ڈیوری روم کی جانب جا رہی تھیں۔

راسمی کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ سوپوٹنگ کے کمرے میں واپس آ گئی اور اُس جگہ سے وہ تصویر اُٹھالی جہاں سوپوٹنگ نے اُسے پھینکا تھا۔ وہ بہت دیر تک آنکھوں پر زور ڈالتے ہوئے سوپوٹنگ کے محبوب کی تصویر دیکھتی رہی۔ مادام کے بچے کے باپ کی تصویر! کسی لگاؤ کے بغیر ایک نوجوان ٹیکرو جی آئی کا خوش باش سیاہ چہرہ اُس کی جانب مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔۔۔ لیکن راسمی اُس کا چہرہ نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ مادام کا چہرہ دیکھ رہی تھی!

گلوئن ساٹنگ

(جمہوریہ دیت نام)

## ہاتھی کے دانت کی کنگھی

چاندنی میں نہایا ہوا جھونپڑا سرکنڈوں کے میدان کے وسط میں پوشیدہ تھا، مین گرو کے چھدرے درختوں کے درمیان جو چڑھتے پانی کے راستے میں تھے۔ یہ ایک ایسی چوکی تھی جو راجے کے لیے بے حد اہم تھی، چھوٹی مگر لوگوں سے بھری ہوئی۔ چونکہ یہاں سے چل نکلنے کے لیے ہمیں اپنی باری کا انتظار کرنا تھا، ہم آرام کر رہے تھے۔ لکڑی کے تختوں پر آلتی پالتی مارے ہم اپنے آپ کو قید محسوس کر رہے تھے۔ وقت گزاری کے لیے ہم ایک دوسرے کو کہانیاں سنانے لگے۔ مجھے ڈوہ بوڑھا کامریڈ نہیں بھولتا جو کمال کا داستان گو تھا۔ مزاحمت کے بارے میں اُس کے کچھ ناوا جب قسم کے لطیفے بھی ہمیں ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیتے۔ جب وہ شروع کرتا تو ہمیشہ مسکراتا اور ذرا مزاحیہ شکل بناتا لیکن اُس رات معاملہ کچھ اور تھا۔ اُس نے گفتگو کرنے پر اصرار کیا اور جب سب لوگ متفق ہو گئے تو وہ خاصی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اُس نے اپنا سر جھکا لیا اور پھر بالکل بے حس و حرکت بیٹھ کر آس پاس پھیلے پانیوں کی وسعت کو دیکھنے لگا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی انتہائی سنجیدہ بات کہنے والا ہے چنانچہ ہم نے فقرے بازی بند کر دی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور مین گرو کے درختوں پر لہریں سرخ رہی تھیں۔ جھونپڑا ایک کشتی کی طرح جھولتا تھا۔ چند بگلوں نے اپنے پر پھڑ پھڑائے اور پرواز کر گئے اور کچھ بے چینی سے ادھر ادھر ہو کر پھر بیٹھ گئے۔ لہریں اور تیز ہوا اسے گزرے ہوئے واقعات کی یاد دلا رہی تھیں۔ اُس نے جیسے دور کی آوازیں

سننے کے لیے اپنے کان اُدھر لگا دیے۔ سرگوشیوں میں اُس نے اپنی کہانی شروع کی۔ وہ ہم سے منہ موڑ کر جھپکتے ستاروں اور افق کو دیکھنے لگا۔

وہ کہانی ایک برس پہلے کی تھی لیکن میں جب بھی اُسے یاد کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں ابھی ابھی ایک خواب سے باہر آیا ہوں۔ اُس روز میں نے ایم۔ جی۔ چوکی سے ڈی۔ اے چوکی تک سفر کیا تھا۔ جونہی موٹر بوٹ ساحل سے جُدا ہوئی ہم میں سے ہر ایک یہ جاننے کا خواہش مند تھا کہ اسے کون چلا رہا ہے۔ یہ صرف تجسس کی وجہ سے نہیں تھا۔ رواجی سے پیشتر رابطہ چوکی کے سربراہ نے ہمیں بتایا تھا کہ ہم ایک طویل اور خطرناک سفر پر جا رہے ہیں اور ہمیں کشتی کے ذریعے جانا ہوگا اور پھر کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا۔ پانی کے اوپر ہم ہیلی کاپٹروں کی نظر میں آ سکتے تھے اور زمین پر کمانڈرز کا سامنا ہو سکتا تھا۔ اگر ہیلی کاپٹر ہمارے سروں پر چکر لگنے لگیں تو ہمیں بے سکون رہنے کا حکم دیا گیا تھا اور ہدایت تھی کہ ہم کشتی چلانے والے کا ہر حکم مانیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری قسمت اُس کے ہاتھوں میں تھی اور ظاہر ہے اسی لیے میں جانا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے؟ لیکن تاریکی کی وجہ سے میں صرف اتنا جان سکا کہ وہ ایک دہلی سی نوجوان لڑکی ہے جس نے کندھوں پر ایک امریکی کاربین ڈال رکھی ہے اور اُس کے گلے میں ایک رومال ہے۔ وہ بہت صاف ستھرے مزاج کی لگ رہی تھی۔ میں نے لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ اس چوکی کی رابطہ لڑکی بہت ہوشیار ہے۔ ایک روز وہ کچھ فوجیوں کو راستہ دکھا رہی تھی۔ ایک دریا عبور کرنے سے پیشتر اُس نے انھیں کنارے سے زور دھان کے ایک کھیت میں رُکنے کے لیے کہا۔ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اس علاقے کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھی۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ ایک جال میں پھنس گئی ہے لیکن اُس نے حواس قابو میں رکھے اور اپنے ساتھی کو کہنے لگی:

”سب کچھ ٹھیک ہے تم جاؤ اور مسافروں کو یہاں لے آؤ۔ میں دوسرے کنارے سے کشتی لے کر آتی ہوں۔“

اُس نے بلند آواز میں بات کی تاکہ دشمن سن لے۔ یوں اُس نے ایک خفیہ پیغام دے دیا۔ اُس کے ساتھی نے آرام سے جا کر مسافروں کو ایک اور جگہ سے دریا عبور کروا دیا جو یہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ اُس نے خود دودستی بم وہاں رکھے اور بحفاظت دریا عبور کر گئی۔ اس دوران دشمن انتظار کرتا رہا کہ وہ آئیں اور اُس کے شکار بنیں۔ وقت گزرتا گیا اور کچھ نہ ہوا۔ کمانڈرز جان گئے کہ اُن کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور وہ ایک دوسرے کو لعن طعن کرتے

اپنی چھاؤنی کی طرف لوٹ گئے۔ راستے میں وہ دستی بہوں پر سے گزرے اور اُن کے پھٹنے سے کئی مارے گئے۔ بعد میں جب لوگ یہ کہانی سناتے تھے تو کہتے تھے کہ لڑکی میں سُو گھنے کی جس بہت تیز تھی اور یوں وہ دشمن کا پتا چلا لیتی تھی۔ اور امریکیوں اور کھ پتلیوں کے درمیان بھی فرق جان جاتی تھی۔

اگر وہی لڑکی، جو وہاں رابیلے پر مامور تھی، اس کشتی کو چلا رہی ہے تو پھر فکر کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں نے سوچا ”اس چوکی پر کتنی عورتیں کام کر رہی ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”صرف دو۔ ایک میں ہوں اور دوسری کھانا پکانے والی۔“

یہ وہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا اور میری فکر ختم ہو گئی اُس کی آواز سن کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اٹھارہ کی ہوگی یا زیادہ سے زیادہ بیس برس کی۔ میں اُسے پسند کرنے لگا تھا اور اُس سے مزید سوال پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ کشتی کو سارٹ کرنے والی مشین میں منہمک تھی۔ میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ اُس نے ڈوری کو تھالی کے گرد لپیٹا اور سیدھی کھڑی ہو کر ایک نزدیکی کشتی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی: ”میں پہلے چلتی ہوں، ٹھیک ہے؟“

”بہت خوب۔۔۔۔۔ اور سفر مبارک ہو۔“ دوسری کشتی کے رابلمرد نے کہا۔

کچھ لوگ اُسے بہن ہائے (سب سے بڑی) کہتے تھے اور کچھ بہن اُت (سب سے چھوٹی)۔ وہ اُن کو بڑے مزیدار جواب دیتی تھی اور اُنھیں ”چھوٹے بھائی“ کہہ کر پکارتی تھی۔ پھر اُس نے بے حد نرم لہجے میں ہم سے کہا کہ ہم اہم چیزوں کو اپنی جیبوں میں سنبھال لیں یا الگ الگ پارسلوں میں تاکہ ہیلی کاپڑوں کے حملے یا کمانڈوز کے حملہ کرنے کی صورت میں نقصان کم سے کم ہو۔

”ان حادثات کے بارے میں اُس نے ہمیں بڑے پیار اور نرمی سے خبردار کیا۔

یقین کیجئے سٹیشن ماسٹر ایسا نہیں کیا کرتا تھا۔۔۔۔۔“

پھر وہ جھکی اور کشتی چلا دی کشتی نے مین گرو کے درختوں کو پیچھے چھوڑا اور تیزی سے تیرنے لگی۔ ہوا میں ایک خوشگوار خنکی تھی۔ اُس کی ہدایات کے مطابق مسافروں نے اپنا سامان درست کرنا شروع کر دیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرے لیے تو اپنے کاغذات اور سفری اخراجات سے زیادہ اہم اور کوئی شے نہ تھی اور اُنھیں میں ہمیشہ اپنی جیب میں محفوظ رکھتا تھا۔۔۔۔۔ یکدم مجھے چھوٹی سی ہاتھی دانت کی کنگھی کا خیال آیا۔ میں نے اپنا بیگ کھولا اور اُسے

تلاش کرنے لگا اور پھر اُسے اپنے کاغذات کے ساتھ رکھ کر اپنے سینے کی جیب میں ڈال لیا اور اُسے ایک سیفٹی پن لگا دی۔

وہ چھوٹی کنگھی میرے ایک نہایت قریبی دوست کی اکلوتی یادگار تھی۔ جب بھی میں اُس کی طرف دیکھتا سکون کے ساتھ پچھتاوا بھی محسوس کرتا۔

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب 1954ء کا اسن دوبارہ قائم ہوا تھا۔ میں اور میرا دوست اپنے آبائی گاؤں گئے۔ ہم دریا میکاٹنگ کی ایک شاخ کے قریب رہتے تھے اور ہمسائے تھے۔ ہم دونوں 1946ء کے آغاز میں مزاحمتی جنگ میں شامل ہوئے تھے اور یہ وہ دن تھے جب فرانسیسی ہمارے صوبے پر حملہ آور ہوتے تھے۔ اُسے ’ساؤ‘ کہا جاتا تھا کیونکہ بہن بھائیوں میں وہ چھٹے نمبر پر تھا۔ اُس کی اکلوتی بیٹی صرف بارہ ماہ کی تھی۔ ہر مرتبہ جب اُس کی بیوی آزاد کردہ علاقے میں اُس سے ملاقات کو آتی تو وہ اُسے اگلی بار بیٹی کو بھی ساتھ لانے کی تاکید کرتا۔ بیوی ایسا کرنے سے کتراتے رہی کیوں کہ راستے میں جنگل تھا۔ اُس کے لیے ایسا خطرناک سفر آسان نہ تھا چنانچہ ساؤ اُسے کیا کہہ سکتا تھا۔ پورے آٹھ برس تک وہ اپنی بیٹی کو ایک چھوٹی سی پُرانی تصویر میں دیکھتا رہا۔ اور اب گھر واپسی پر اُس کے پداری جذبات بیان نہیں کیے جاسکتے تھے۔ کشتی ساحل کے قریب ہوئی۔ اُس نے ایک آٹھ سالہ بچی کو دیکھا جو سُرخ پھولوں والی بنیان اور کالی پتلون پہنے آرم کے درخت کے سایے میں ایک گھر کے صحن کے سامنے کھیل رہی تھی۔ اُس کے بالوں میں بوڑھا بنا ہوا تھا۔ اُس نے کشتی کے کنارے لگنے کا انتظار کیے بغیر چھلانگ لگا دی۔ کشتی پیچھے ہٹ گئی اور میں تقریباً لنگ گیا۔ وہ آگے بڑھا اور پھر چیخ کر کہنے لگا: ’تھو، میری بچی!‘

اُس لمحے میں اُس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُچھلتی ہوئی اُس کے پاس آئے گی اور اُس کی گردن میں باہیں ڈال دے گی۔ وہ چند قدم اور آگے گیا اور تھک کر بازو پھیلا دیے تاکہ اُسے آغوش میں لے سکے۔ اُس کی چیخ سے خوفزدہ ہو کر بچی اُسے اپنی گول گول آنکھوں سے نکلے جا رہی تھی اور بہت کھوئی کھوئی سی اور شش و پنج میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور جب بھی وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا اُس کے دائیں رخسار پر زخم کا نشان سُرخ ہو جاتا اور وہ دیکھنے میں بہت خوفناک لگتا۔ ایسے ہی چہرے اور کھلے ہوئے بازوؤں کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور کانپتی ہوئی آواز میں بڑبڑانے لگا: ’آؤ

میری بیٹی، آ جاؤ۔‘  
 بیٹی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور وہ آنکھیں جھپکاتی ہوئی مجھے دیکھے جا رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو یہ کون ہے؟ اُس کا چہرہ لیکھت زرد پڑ گیا۔ وہ ایک دم وہاں سے بھاگ نکلی اور ’ماں، ماں‘ چلانے لگی۔ ساؤ بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں اپنی بیٹی پر مرکوز تھیں۔ اُس کا چہرہ اذیت سے مسخ ہو رہا تھا اور ہاتھ یوں نیچے آ رہے تھے جیسے مردہ ہوں۔

چونکہ یہ سفر خاصا طویل تھا ہمارے پاس گھر میں گزارنے کیلئے صرف تین دن تھے اور ان دنوں میں تو اپنے باپ کو پہچان نہیں سکتی تھی۔ اُس نے اُس رات اُسے اپنی ماں کے پاس پھٹکنے تک نہ دیا۔ بڑی شدت سے احتجاج کرتے ہوئے وہ اپنے بستر سے نکل کر زمین پر کھڑی ہو گئی اور اسے بھی کھینچ کر بستر سے باہر نکال دیا۔ دن کا بیشتر وقت وہ اُسے بہلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ تھو نے اُسے ’ابا‘ نہ کہا۔ جب اس کی ماں نے اُسے کہا کہ وہ رات کے کھانے کے لیے باپ کو بلا لائے تو اُس نے جواب دیا: ’تم خود ہی جا کر بلاؤ۔‘  
 ماں غصے سے پھٹ پڑی۔ اس نے چھڑی پکڑ کر پیٹنے کی دھمکی دی اور اصرار کیا کہ وہ اس کی بات مان لے۔

’رات کے کھانے کے لیے آ جاؤ۔‘ تھو نے بالآخر صرف اتنا کہا۔ ساؤ جیسے بہرا ہو کر بیٹھا تھا اور لفظ ’ابا‘ سننے کے انتظار میں تھا۔ وہ باورچی خانے ہی سے اونچی آواز میں کہنے لگی: ’رات کا کھانا تیار ہے۔‘ ساؤ وہیں بیٹھا رہا۔ لڑکی اپنی ماں کی جانب غصے سے دیکھنے لگی۔  
 ’میں نے وہی کچھ کیا ہے جو تم نے کہا تھا لیکن اُسے میرے بلانے کی پروا ہی نہیں ہے۔‘  
 ساؤ نے سر جھٹکتے ہوئے بیٹی کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ اس قدر دل گرفتہ تھا کہ اس کے آنسو اُبل پڑنے والے تھے۔ چادلوں کی پتیلی چولہے پر چڑھا کر، اگلے کھانے کی تیاری کرنے کے لیے، اس کی بیوی خورد و نوش کا سامان خریدنے کے لیے بازار جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے تھو سے کہا کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ باپ سے مدد لے لے۔ پتیلی اُبل رہی تھی۔  
 لڑکی نے ڈھکنا اُتارا اور چادلوں میں چھپ چلانے لگی۔ پتیلی بھاری ہونے کی وجہ سے وہ چادلوں کی چیخ نہیں اُتار سکتی تھی۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ میں نے سوچا اب اس کی ہچکچاہٹ ختم ہونے والی ہے کیوں کہ اب اس کے پاس مجھے مدد کے لیے بلائے بغیر چارہ ہی نہیں۔ لمبے بھر کے لیے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”پتیلی اُبل رہی ہے۔ مہربانی کر کے مجھے پیچ اتار دو۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ میں نے اسے باپ کو بلانے کا طریقہ سکھانے کے لیے کہا: ”تمہیں کہنا چاہیے تھا: ”اباجی میری مدد کریں۔“ اس نے میرے الفاظ سننے ان سنے کر دیے اور اپنے ہی طریقے سے باواز بلند کہتی رہی: ”پتیلی اُبل رہی ہے، چاول جل جائیں گے۔“ ساؤ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

”اگر تم نے چاول خراب کر دیے۔۔۔۔۔۔ میں نے اسے ڈرایا، تو تمہیں ماں سے مار پڑے گی۔ صرف اتنا کہہ دو: اباجی میری مدد کریں۔“

اب پانی ابل کر پتیلی سے باہر آ رہا تھا اس لیے وہ خوف زدہ سی ہو کر کچھ سوچتے ہوئے نیچے دیکھنے لگی۔ تاہم وہ اب بھی اپنی بات پراڑی ہوئی تھی۔ طیش میں آ کر اس نے پتیلی چولہے سے اتارنے کی کوشش کی لیکن نہ اتار سکی۔ اس نے دوبارہ اوپر دیکھا۔ اب پانی پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے جوش کھا رہا تھا۔ اس کی ہمت جو اب دینے والی تھی اور ممکن تھا کہ وہ چلانے لگے۔ اس نے پہلے پتیلی کو دیکھا، پھر ہم دونوں کو۔ وہ بیک وقت قابلِ رحم اور مضحکہ خیز لگ رہی تھی آخر کار اُس نے ایک بڑا چچھو لیا اور اسے پانی نکالنے کے لیے استعمال کرنے لگی اور جو کچھ وہ بڑا رہی تھی وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ واقع عجیب و غریب مخلوق تھی۔

کھانے کے دوران ساؤ نے مچھلی کے زرد انڈوں کو اُس کے سامنے رکھا لیکن ٹھونے اُنھیں کھانے کی تیلیوں کے ساتھ پیالے میں ایک طرف رکھ دیا اور پھر ایک دم اُنھیں پھینک دیا۔ چاول ہر طرف بکھر گئے۔ لڑکی کی اس حرکت پر ساؤ کو غصہ آ گیا اور اُس نے اُسے چوتڑوں پر پیٹا۔ ”تم اتنی خردماغ کیوں ہو؟“ اُس نے چیخ کر کہا۔

میرا خیال تھا کہ بچی خوب روئے گی یا بھاگ جائے گی لیکن وہ چپ بیٹھی رہی اور نیچے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے انڈوں کو اٹھا کر واپس پیالے میں رکھ لیا۔ پھر وہ اٹھی اور خاموشی سے دریا کی جانب چلنے لگی۔ اُس نے کشتی میں بیٹھ کر اُس کی زنجیر کھولی اور جان بوجھ کر اسے کھڑکھڑا کر شور پیدا کیا اور پھر کشتی بھیتی ہوئی دریا کے پار چلی گئی۔ وہ اپنی دادی کے پاس پہنچی اور اُسے سب ماجرا کہہ سنایا اور پھر رونے لگی۔ اسے واپس لانے کے لیے ماں شام کو اس کے پاس گئی اور اسے سمجھایا کہ وہ گھر واپس آ جائے لیکن وہ نہ مانی۔ ساؤ کو اگلے روز چلے جانا تھا۔ اُس کی بیوی آخری رات اُس کے ہمراہ گزارنا چاہتی تھی اس لیے اُس نے بھی بیٹی کی واپسی کے





سکین۔“

”یہ شخص اُس تصویر کی طرح بالکل نہیں ہے جو میرے باپ کی ہے۔“

”پھر بھی وہ تمہارا باپ ہے۔ شاید وہ کچھ بڑی عمر کا لگتا ہے۔“

”نہیں اس لیے نہیں کہ وہ بڑی عمر کا لگتا ہے، میرے باپ کے گال پر کوئی نشان

نہیں۔“

چنانچہ دادی پوری بات سمجھ گئی اور اُسے سمجھایا کہ اس کا باپ فرانسیسیوں سے جنگ کرنے گیا تھا اور وہاں زخمی ہو گیا تھا۔ اُس نے اُن جرائم کا قصہ بیان کیا جو نمر کے دوسرے کنارے پر واقع چوکی میں فرانسیسیوں نے کیے تھے۔ لڑکی خاموشی سے سنتی رہی لیکن کبھی کبھار کسی بالغ انسان کی طرح اپنے سر کو جھکتی اور آہ بھرتی۔

اگلی صبح اُس نے دادی سے کہا کہ وہ اُسے اس کے گھر چھوڑ آئے۔

اب وہ اپنے باپ کی چھاتی کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ ساؤ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے سامنے رونے لگ جائے۔ وہ اُسے ایک ہاتھ سے اٹھائے ہوئے چلنے لگا اور دوسرے سے اُس نے اپنے آنسو پونچھے۔ اُس نے اُس کے بالوں کو پھو ما اور سرگوشی کی: ”اب بابا کو جانے دو۔ میں جلد ہی واپس آؤں گا۔“

”نہیں، لڑکی چیختی۔ اُس نے اُس کے کندھوں کے گرد اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کی مدد سے وہ اُس کے ساتھ چھٹی رہی۔ وہاں موجود لوگ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔ میں بھی آرام سے سانس نہیں لے رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں ساؤ سے کہوں کہ وہ چند روز اور ٹھہرا رہے لیکن اس میں کچھ مشکلات درپیش تھیں۔ ہمیں ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ ہم نے جنوب میں رہنا ہے یا اُسٹریلیا ہو کر شمال کو جانا ہے۔ اس صورت میں کہ شاید ہمیں شمال کو جانا ہو ہمیں معینہ وقت پر واپس آنا تھا اور ضروری انتظامات کرنے تھے۔ ہمیں اب چلے جانا تھا۔ لوگوں نے لڑکی کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

ساؤ کی بیوی نے پچکارا: ”بہت ہی پیاری تھی، اپنے بابا کو جانے دو۔ جب ہمارا ملک

دوبارہ متحد ہو جائے گا تو واپس آ جائے گا اور پھر کبھی نہیں جائے گا۔“

دادی نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ”میری اچھی بیٹی، اپنے باپ کو

جانے دو۔ اس سے ایک کنگھی لانے کی فرمائش کرو۔“

”میرے لیے ایک کنگھی خریدنا بابا اور اُسے گھر لانا۔“ ٹھونے سسکی بھر کر کہا۔ تب

اُس نے اپنی گرفت ڈھلی کی اور اپنے پاؤں پر گر گئی۔

”کچھ عرصے بعد میں اور ساؤ مشرقی نام بول گئے اور وہاں ایک بڑی تنظیم میں کام

کرتے رہے۔ 1954ء سے لے کر 1959ء کا زمانہ بے حد تاریک تھا۔ امریکی ڈانم حکومت

ایسے لوگوں کو گرفتار کر رہی تھی جن کا تعلق کسی زمانے میں تحریک مزاحمت سے رہا تھا۔ ہمیں جنگل

میں رہنا پڑا تھا۔ وہاں ہماری زندگی میں بہت کچھ ہوا جسے بیان کرنے کے لیے ایک پوری رات

درکار ہے۔ یہ بھی ہوا کہ صرف ایک رات میں تین مرتبہ کمانڈو سپاہیوں نے ہمیں گھیرا اور کبھی ہمیں

درختوں کے پتے کھا کر پیٹ بھرنا پڑا لیکن یہ ایک اور کہانی ہے۔

”ہم اپنے ٹھولوں میں رات بسر کرتے تھے اور اُن پر پلاسٹک شیٹ کی چھت ہوتی

تھی۔ ساؤ اکثر اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا کہ اُس نے اپنی بیٹی کو پیٹا تھا۔ ایک مرتبہ وہ یک

دم اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا: ”یہاں کے لوگ اکثر ہاتھیوں کے شکار کو جاتے ہیں۔ میں کوشش کرتا

ہوں کہ شاید مجھے کسی سے ہاتھی دانت کا کوئی ٹکڑا مل جائے اور میں اُس سے اپنی بیٹی کے لیے ایک

کنگھی بنا لوں۔“

”اس کے بعد وہ اسی اُمید کے خواب میں مبتلا رہا۔ کچھ عرصے کے بعد جب ہمارے

پاس خوراک کم ہونے لگی تو ہم نے تیر کمانوں کے ساتھ شکار کرنے کے بارے میں غور کیا۔ ہم

بندوق استعمال نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ ہم جنگل کی خاموشی کو توڑ کر اپنے ہونے کا پتہ نہیں دینا

چاہتے تھے۔ ہمیں ہاتھیوں کے شکار کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا اور یہ ایک اتفاق تھا کہ ایک ہاتھی

ہمارے سامنے آ گیا۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس کھیل میں دلچسپی نہ تھی لیکن ساؤ نے اُس کا پیچھا کیا۔

وہ ایک دوست کے ہمراہ جھاڑیوں میں چھپ کر اُس قریب آنے کا انتظار کرنے لگا اور اُنھوں

نے اُس کی آنکھوں کے عین درمیان میں نشانہ لگا لیا۔

مجھے اب بھی وہ دو پہر یاد ہے۔ جنگل میں برستی بارش تھم چکی تھی اور درختوں کے پتوں

پر پانی کے قطرے چمکتے تھے۔ میں اپنی پلاسٹک کی چھت کے نیچے کام کر رہا تھا کہ میں نے شور و غل کی

آواز سنی۔ میں نے اوپر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ساؤ اُس راستے پر بھاگ رہا ہے جو ہماری

طرف آتا ہے۔ اُس نے ہاتھی دانت کا ایک ٹکڑا فضا میں بلند کر کے مجھے دکھایا۔ اُس کا چہرہ کسی

بچے کے چہرے کی طرح دمک رہا تھا۔ بعد میں اُنے بیس ملی میٹر کا کارتوس توڑ کر ایک چھوٹی سی



کرسائیگان یا سرکنڈوں کے میدان جا چکے ہیں۔ ان کے گاؤں میں امریکیوں اور کٹھ پلی فوجیوں نے ”ٹوکا ٹنگ“ کورس کیے تھے۔ انھوں نے لوگوں کے گھر جلا کر انھیں کیپوں میں نظر بند کر دیا تھا۔ کچھ برسوں بعد وہ جگہ بالکل ویران ہو گئی۔

میں نے وہ کنگھی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے میں بہت اذیت محسوس کر رہا تھا۔

کشتی کی موٹر چھٹپھٹاتی جا رہی تھی۔ میں بڑی شدت سے خواہشمند تھا کہ اُس لڑکی کا چہرہ دیکھ لوں جس پر میری سلامتی کا انحصار ہے۔ رات بہت تاریک نہ تھی اور تاروں بھرے آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ مدہم روشنی میں لڑکی کا چہرہ ٹھیک نظر نہیں آ رہا تھا سوائے اُس کی گول شکل اور دونوں آنکھوں کے جن کی نظروں کو بیان کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اُسے کہیں مل چکا ہوں۔

یک دم کسی نے ”ہوائی جہاز، ہوائی جہاز“ کا شور مچا دیا۔

کشتی مسافروں کی بے چینی کی وجہ سے ہچکولے کھانے لگی۔ کئی لوگ چیختے لگے:

کنارے کی طرف چلو، کنارے کی طرف چلو،

”ہوائی جہاز کہاں ہے؟“

”اس کی روشنیاں ہمارے عقب میں دکھائی دے رہی ہیں۔“

”کنارے کی طرف چلو۔ کنارے کی طرف۔۔۔۔۔ ایک جیٹ ہماری طرف آ رہا ہے۔“

رابطہ لڑکی نے کشتی کی رفتار آہستہ کی اور کچھ دیر کے لیے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہوائی جہاز نہیں کسی ستارے کی روشنی ہے۔“

اُس کی پُرسکون آواز نے کشتی میں پھر سے سکون بحال کر دیا۔ اس کی آواز ایسی ہی لوجھار میٹھی آواز تھی۔ اُس نے کشتی کی رفتار پھر تیز کر دی۔

کئی دنوں کے پیدل مارچ کے بعد موٹر بوٹ پر سفر بہت خوشگوار لگ رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں دشمن کے ہوائی جہازوں سے خوفزدہ تھا۔ کشتی ایک نہر میں چلی جا رہی تھی جو ایک کھلے کھیت میں سے گزرتی تھی۔ یہاں پر کوئی مکان نہ تھی سوائے بانس کے جھنڈوں کے جو خاصے فاصلے پر تھے۔ شاید رابطہ لڑکی کو میرے خیالات کا علم ہو گیا اور اُس نے کشتی تیز کر دی۔ پانی تیزی

سے اچھل رہا تھا اور اس سے اُٹھنے والی لہریں کناروں تک پہنچ کر گھاس اور جنگلی پودوں کی جڑوں کو کپکپا رہی تھیں۔

تمام مسافر پرسکون تھے اور سفر کا لطف اٹھا رہے تھے کہ افسر رابطہ نے کشتی کا انجن بند کر دیا اور چیخ کر کہا: ”ہوائی جہاز۔“

وہ کشتی کو ایک بانس کے جھنڈ کی جانب لے گئی۔ ہمارے عقب میں آنے والی ایک اور کشتی نے بھی وہیں پناہ لی۔ اب ہم نے امریکی ہیلی کاپٹروں کی گھوں گھوں کی آواز سنی شروع کر دی۔ مجھے یہ معلوم تو نہ تھا کہ کہانی کے مطابق اُس کی سونگھنے کی جس کتنی تیز ہے لیکن یہ بات حیران کن تھی کہ اُس نے موٹر بوٹ کے انجن کے شور میں بھی ہیلی کاپٹروں کی آواز سن لی تھی۔ کشتی ہچکولے کھانے لگی اور کچھ مسافروں کا توازن بگڑ گیا۔ وہ انھیں تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی: ”چچا جان، خاموش رہیے۔ ہیلی کاپٹر ابھی دور ہیں۔ کنارے پر لو دکرا دھرا دھرا پھیل جائیں اور خود کو چھپالیں اور اگر وہ آپ پر چمکتی روشنیاں پھینکیں تو بالکل بے حس و حرکت بیٹھے رہیے۔“

وہ ہدایات دے رہی تھی اور اس دوران میں میرے علاوہ سب لوگ کنارے پر جا چکے تھے۔ میں گودنے کو تھا کہ لڑکی کہنے لگی: ”چچا تم یہیں رہ جاؤ۔ کشتی میں چند لوگ ہی تو ہیں۔ فکر نہ کرو۔“

اگر یہ مشورہ کوئی اور دیتا تو میں ہرگز اس پر عمل نہ کرتا لیکن اُس کے طرز عمل نے مجھے اتنا متاثر کیا تھا کہ میں کشتی میں ہی بیٹھا رہا۔ ہیلی کاپٹر آنے لگے اور نہر کے دوسرے سرے سے اُن کی چمکتی روشنیاں ہماری طرف بڑھنے لگیں۔ اس قسم کے حملے کے لیے امریکی تین ہیلی کاپٹر استعمال کرتے تھے۔ ایک روشنی پھینکتا جاتا تھا اور باقی دو گولیاں برساتے جاتے تھے۔ لڑکی نے پھر اپنا مشورہ دہرایا: ”درختوں کے پتوں سے اپنے آپ کو چھپا لو اور بالکل دم سادھے بیٹھے رہو۔“

ہیلی کاپٹروں کی روشنی میں آنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ جب روشنیاں مجھ پر پڑ رہی تھیں تو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں اپنے اوپر اُن کے پردوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سن رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کشتی انھیں نظر آ جائے گی کیوں کہ زوپوشی کے لیے استعمال کرنے والی چیزیں اُڑ گئی تھیں اور ہمارے سامان کے تھیلے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میں نے سوچا کہ بس اب میرا

انجام قریب ہے اور میں نے اپنے گھٹنوں میں سر دبا کر اپنے آپ کو چھوٹا کرنے کی کوشش کی۔ لڑکی نے مجھے خاموش کرانے کے لیے کہا: ”جس طرح ہم اُنھیں دیکھ رہے ہیں وہ ہمیں نہیں دیکھ رہے۔“ اُس کے لفظوں کا وہ اثر تو نہ ہوا جو پہلے ہوا تھا لیکن مجھے یہ ترکیب سوجھی کہ پانی میں چھلانگ لگا دوں لیکن عین وقت پر میں نے اپنے آپ کو روک لیا۔

وہ خوفناک روشنی کم ہوتی گئی اور انجنوں کا شور گھٹتا گیا اور پھر نیلی کا پٹر بتدریج دُور ہوتے گئے۔ سب کچھ پھرتا ریک ہو گیا لیکن میں پھر بھی حرکت نہیں کر رہا تھا کہ کہیں دشمن دوبارہ نہ آجائے۔

”وہ اپنی طاقت کا مظاہر کرتے ہیں لیکن اُنہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ ہمیں صرف پُرسکون رہنا چاہیے اور حرکت نہیں کرنی چاہیے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ پھر اُس نے کھیت کی جانب دیکھا اور مسافروں کو واپس آنے کے لیے کہا۔ کئی تو خچر رہے تھے۔ وہ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔ کشتی پھر چل پڑی۔

نصف شب کے قریب ہمارا گروہ کنارے پر اُتر گیا اور پھر پیدل سفر شروع کر دیا۔ ہم دھان کے ایک کھیت میں تظار بنا کر چل رہے تھے جہاں دلدلی، ناہموار اور پھسلواں گڑھے تھے۔ ہم اپنی چپلیں ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے تھے اور ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتے تھے۔ پھر بھی اکثر ہم ایک دوسرے کے اُپر جا گرتے۔ دریا کے کنارے کے قریب ایک جگہ رابطہ لڑکی نے ہمارے گروہ کو رکنے کا حکم دیا اور پھر دو لڑکوں کو اس علاقے میں روانہ کیا تاکہ پتہ چلے کہ وہاں صورت حال کیسی ہے۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر اُن کی دشمن کے کمانڈو سپاہیوں سے مُڈھ بھیڑ ہو گئی۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو حسب سابق دریا کے کنارے بانوں میں نہیں چھپایا ہوا تھا بلکہ وہ براہ راست حملہ آور ہو گئے۔ ہر سمت سے گولیاں چلنے لگیں اور کارتوس ہوا میں اُڑنے لگے۔

”بھائی ٹو، تم اس گروہ کو لے کر آگے جاؤ۔ میں یہیں ٹھہروں گی۔“ رابطہ لڑکی نے حکم دیا۔ اُس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہماری لیڈر بھی وہی ہے۔ مجھ میں ایک عجیب سی خواہش نے جنم لیا: یہ کہ میں اُسے کہوں کہ وہ یہاں ٹھہرنے کی بجائے ہمارے ساتھ چلے لیکن وہ ابھی سے بہت دُور ہو چکی تھی۔ گولے سیٹیاں بجاتے ہوئے آ رہے تھے اور کچھ فاصلے پر گر رہے تھے۔ ہم گڑھوں کے بالکل ساتھ دیکے ہوئے تھے اور اپنے سروں کو نیچے رکھنے کی احتیاط کر رہے تھے۔

میں نے اپنے بائیں طرف کاربین کے فائر کی آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی تمام تر گولیوں کا رُخ ادھر ہو گیا۔ تب میں جان گیا کہ رابطہ لڑکی نے جان بوجھ کر دشمن کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی ہے۔

”ٹو، بھاگ جاؤ“ حکم آیا۔ ہمارا گروہ آگے بھاگنے لگا۔ مجھے دراصل فائرنگ کی عادت نہ تھی لیکن میں خوفزدہ نہیں تھا۔ میرے سارے خدشے رابطہ لڑکی کے مقدر کے لیے تھے۔ ہم کھیت میں ادھر ادھر بھاگتے چلے جا رہے تھے اور ہمارا رُخ گھنی جھاڑیوں کی طرف تھا اور وہاں سے دریا تک جسے ہم نے بحفاظت عبور کر لیا۔

گولیوں کی بوچھاڑ تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ میں نے لڑکی کی کاربین کا فائر سننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور یوں میری فکر مندی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہم جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا کمانڈر کی زد سے نکلے اور متعین جگہ پر وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ یہ ایک گاؤں میں درخت کی ٹہنی تھی۔ لیکن ہمیں ڈی اے چوکی سے بھیجے جانے والے نئے راہنماؤں کے لیے زیادہ دیر انتظار کرنا پڑا۔ ہم انناس کے ایک کھیت میں جمع تھے جس پر دشمن نے زہریلی گیس چھڑک دی تھی اور یوں پودے پھل نہیں دیتے تھے۔ ہم سب موجود تھے۔ کچھ کی ربڑ کی چپلیں اور چند ایک سامان کے تھیلے دریا عبور کرتے ہوئے ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ اگرچہ میں عمر میں ان سب سے بڑا تھا لیکن میری کوئی شے گم نہیں ہوئی تھی۔

ہم سب بے حد تھکے ہوئے تھے۔ راہنماؤں نے ہمیں صرف ایک رات آرام کرنے دیا۔ کچھ نے اپنے تھیلے درختوں پر لٹکائے اور اپنے بیگ سروں کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے۔ جلد ہی وہ خراٹے لے رہے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں کچھ پریشانی کے عالم میں اوجھنے لگا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے آبائی گاؤں کو جا رہا ہوں۔ کئی گاؤں کچھ بدلے بدلے نظر آ رہے تھے۔ ان کے باسیوں کو نظر بندی کیپوں میں بند کر دیا گیا تھا اور وہ اپنے گھروں کو گرا دینے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ بعد میں ان کو ملیا میٹ کر دیا گیا۔ باغات بھی بالکل بدل چکے تھے۔ مجھے وہ تمام مناظر پھر سے دکھائی دینے لگے جو میں نے ساؤ کے ہمراہ دیکھے تھے جب ہم اپنے گاؤں آئے تھے اور جب ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوئے اور مجھے وہ کنگھی دے رہا تھا جو اب بھی میرے پاس تھی۔ کبھی کبھار میری نیند کھل جاتی اور میں اُن ساتھیوں کے بارے میں سوچنے لگتا جو ہمارا پیچھا کرنے والوں پر نظر رکھنے کے لیے تعینات تھے اور اُن میں وہ رابطہ





”تمہارا نام کیا ہے!“

”ٹھو“

”ٹھو، کیا واقعی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تمہاری باپ کا نام ساڈ ہے اور تمہاری ماں کا نام پند ہے۔ کیا میں ٹھیک کہتا ہوں؟“  
وہ اتنی متعجب ہوئی کہ اُس کے مُنہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا اور وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتی رہی۔

اور اسی وقت ڈی۔ اے۔ چوکی کے راہنماؤں نے ہمیں چلنے کے لیے تیار ہونے کا کہا۔ لیکن مجھے اُن کے کہنے کی کوئی پروا نہ تھی اور نہ ہی میں اس وقت کچھ اور سننا چاہتا تھا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی حیرت سے باہر نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے مسلسل گھورتی رہی۔ ”بس یہ آنکھیں میری ہی جھتیگی کی ہیں۔“ میں نے اپنے آپ سے کہا اور دوبارہ پوچھا، ”جھتیگی تمہارے باپ کا نام ساڈ ہے نا؟“  
”ہاں لیکن تم کیسے جانتے ہو؟“

میں نے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے کچپاتی ہوئی آواز میں کہا: ”میں تمہارا چچا ہوں۔ کیا تمہیں وہ دن یاد ہے جب تمہارے باپ نے گھر چھوڑا تھا اور تم سے ایک کنگھی لانے کا وعدہ کیا تھا؟“

اُس نے آہستہ سے سر ہلایا ”ہاں مجھے یاد ہے۔“

اس طرح کی غیر متوقع ملاقاتیں مزاحمتی جنگ کے دوران اکثر ہو جاتی ہیں۔ لڑکی پر ایک نگاہ ڈال کر میں نے ہاتھی دانت کی کنگھی اپنی جیب سے نکالی۔ ”یہ تمہارے باپ نے تمہارے لیے بھیجی ہے۔ اُس نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔“  
اُس کے حیرت میں گم چہرے پر اس کی آنکھیں پہلے سے بڑی لگ رہی تھی۔ اُس نے وہ کنگھی لے لی جو یوں لگتا تھا اُسے اُس دن کی یاد دلا رہی ہے جب وہ اپنے باپ سے جدا ہوئی تھی۔ اس منظر نے مجھے بہت دکھ دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت خوش ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی خوشی کو رنج میں بدلوں۔ ”تمہارا باپ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ گھر واپس نہیں آ سکتا تھا اس لیے اُس نے مجھے یہ کنگھی تمہارے لیے دے دی۔“  
اُس کی پلکیں کچپائیں اور وہ سرگوشی میں بولی: ”آپ کو غلط نہیں ہوئی ہے۔ یہ کنگھی

میرے باپ کی جانب سے ہرگز نہیں ہے۔“

میں بے حد مایوس ہوا بلکہ کچھ فکر مند بھی اور اُس سے پوچھا: ”تمہارے باپ کا نام ساڈ ہے اور ماں کا بند۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟“

”ہاں“ وہ رونے والی تھی کیوں کہ آنسو اُس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے لیکن اُس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ ”اگر تمہیں غلط فہمی نہیں ہوئی تو تم جان بوجھ کر جھوٹ بول رہے ہو۔ کیوں کہ تم مجھے دکھ نہیں دینا چاہتے۔ میں جانتی ہوں کہ میرا باپ مر چکا ہے۔“ اُس کی آنکھوں میں پھر چمک آئی اور اُس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ ”میں اپنے دکھوں پر قابو پا سکتی ہوں۔ تمہیں مجھ سے سچ کہہ دینا چاہیے۔ مجھے دو سال پہلے پتا چل گیا تھا کہ میرا باپ مارا گیا ہے اور تب میں نے اپنی ماں سے ایک رابطہ افسر بننے کی اجازت لی تھی۔“

وہ اور بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اُس کے گلے میں ہی دم توڑتے جاتے تھے۔ اُس نے سر جھکا کر زمین کو دیکھا۔ اُس کے بال کپکپائے۔ میں خاموش رہا۔ گردہ میں شامل میرے ساتھی چیخ چیخ کر مجھے بلا رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں زیادہ دیر تک نہیں رُک سکتا۔ میں نے اُس کا پتہ پوچھا اور اُس کی ماں اور رشتے داروں کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ ٹھو سے ملاقات کی خوشی صرف چند لمحوں کی تھی۔ میرے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں

نے اُس پر ایک نگاہ ڈالی اور جبلی طور پر کہا: ”خدا حافظ میری بیٹی!“

وہ کچھ بڑبڑائی جو میں سن نہ سکا۔ کچھ دور جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ چلی آ رہی تھی۔ وہ ایک گڑھے کے قریب رُکی۔ دھان کے چھوٹے چھوٹے پودے، جو ہوا سے جھوم رہے تھے، ان لہروں سے مشابہت رکھتے تھے جو اُس کی جانب بہتی جا رہی تھیں۔ پس منظر میں زہریلی گیس سے تباہ شدہ اور پتوں سے عاری ناریل کے درخت چھلی کے دیو زاد ڈھانچوں کی طرح ہوا میں لٹکے ہوئے تھے۔ ان کے تازہ پتے نکل آئے تھے اور وہ دور سے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے تلواروں کا ایک جنگل ہے جس کا رخ آسمان کی جانب ہے۔

پریم کمار  
ملانیشیا

## دیوار کے ادھر

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو ایسے گھرتے جو آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ دراصل گھر تو ایک ہی تھا اور اس کی چھت بھی ایک ہی تھی لیکن اس میں دو مختلف خاندان رہ رہے تھے اس لیے انھیں دو گھر ہی کہنا چاہیے۔ پہلے گھر میں ایک پنجابی شخص رہتا تھا اور دوسرے میں ایک چینی۔ پنجابی کا خاندان کا ایک بیوی، کئی بیٹوں اور ایک ننھی سی بچی پر مشتمل تھا۔ وہ گائیں پالتا تھا۔ ادھر چینی شخص کے بھی بیوی بچے تھے اور وہ رکشا چلاتا تھا۔ چینی اور پنجابی کے گھر کی ایک دیوار مشترک تھی اور اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے سوراخ اور جھریاں تھیں۔ پنجابی خاندان بڑی آسانی سے دیوار میں سے جھانک کر دیکھ سکتا تھا کہ ادھر چینی گھر میں کیا ہو رہا ہے اور انھیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ادھر سے چینی خاندان بھی تاک جھانک کرتا رہتا ہے۔ یہ دیوار چھت تک نہیں پہنچتی تھی اور دونوں گھروں کا بالائی کھلا حصہ مشترک تھا۔ پنجابی بچے کبھی کبھار شہتیروں سے بنی ہوئی اس دیوار پر چڑھ کر چینی گھر میں جھانکنے لگتے۔

یہ دونوں گھر اور اس میں آباد خاندان ایک عرصے سے پہلو پہ پہلو رہتے آئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ چینی عورت روز بہ روز، جیسا کہ حاملہ عورتیں ہوتی ہیں موٹی ہونے لگی اور چھوٹی بچی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے چینی عورت کو گھورتی رہتی اور جب کبھی چینی عورت اس کی جانب دیکھتی تو وہ فوراً منہ بند کر

لیتی اور دوسری طرف دیکھنے لگتی اور جو نئی چینی عورت کا دھیان کسی اور طرف ہوتا وہ دوبارہ اس پر نظر میں جمادیتی۔ یہ آنکھ بھولی ایک مدت جاری رہی لیکن چھوٹی بچی یہ نہ جان سکی کہ آخر اس خاتون کو ہوا کیا ہے۔ انہی دنوں پنجابی کی ایک گائے بھی بچہ دینے والی ہو گئی۔ چھوٹی بچی کو اس گائے میں دوسری گائیوں کی نسبت کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا تھا۔ ”صرف یہ ہے کہ موٹی ہوتی جا رہی ہے۔“ اس نے سوچا۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا اور چھوٹی بچی اس چینی عورت کو نہ بھول سکی کیونکہ وہ ہمیشہ سامنے ہی تو ہوتی تھی۔ ایک صبح چھوٹی بچی نے عجیب و غریب اور بہت ہی بلند چیخیں سنیں جو دیوار کی دوسری طرف سے آرہی تھیں۔

ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بلی زور زور سے رورہی ہے۔ بچی کی ماں اٹھی اور بھاگتی ہوئی چینی عورت کے گھر چلی گئی اور جب بچی نے بھی اس کے ساتھ جانے پر اصرار کیا تو اسے جھڑک دیا گیا کہ ”خبردار اگر میرے پیچھے آئیں تو تھپڑ ماروں گی۔“ بچی پھوٹاڑے میں واقع باورچی خانے کی طرف بھاگی کہ شاید یہ آواز وہاں سے آرہی ہے لیکن نہیں، آواز دیوار کے پیچھے سے آرہی تھی۔ اس نے فوراً دیوار کے سوراخوں اور جھریوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے صرف چار پائی کے پائے اور اپنی ماں کے پاؤں نظر آئے۔

بچی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ وہ ہر صورت میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی لیکن دیکھ نہیں سکتی تھی۔ پھر اس نے اوپر دیکھا کہ اس کا بھائی دیوار کے ساتھ چمٹا ہوا ہے اور اوپر سے دوسری طرف جھانک رہا ہے۔ اس نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن اس کے بھائی نے ایسا نہ کرنے دیا اور اسے جھڑک کر نائگیں ماریں۔ اس دوران بلی ایسی چیخیں تو سنائی دیتی رہیں لیکن بچی کو کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس کے بھائی نے بھی اُسے بالکل نہ بتایا کہ اس نے دیوار کے اوپر سے کیا دیکھا تھا اور جب وہ کافی دیر کے بعد نیچے آیا تو اس نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں۔ اسی وقت اس کی ماں واپس آگئی اور اس نے بتایا کہ چینی عورت کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی ہے۔

بچی کی ماں ابھی ہاتھ دھو رہی تھی کہ اس کے باپ کی گرجدار آواز سنائی دی کہ ان کی گائے کے بچہ جننے کا وقت بھی آ گیا ہے۔ بچی کو شکر کا ایک ٹین دیا گیا اور کہا گیا کہ اسے فوراً اپنے باپ کے پاس لے جائے۔ وہ بھاگتی ہوئی پہاڑی پر پہنچی جہاں گائیوں کا باڑہ تھا اور وہاں اس نے پچھیا کو دیکھا: چھوٹی سی سفید اور بھوری اور گیلی۔۔۔ اور گائے اسے چاٹ رہی تھی۔ باپ

نے بچی سے شکر لی اور بچھیا کا منہ بیٹھا کیا اور اسے بتایا کہ وہ گائے سے پرے رہے ورنہ وہ اسے سینگ مارے گی۔ بچھیا بالکل نئی نکور تھی اور وہ ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتی تھی اور اس کوشش میں گر جاتی تھی اور گائے اس کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ بچی نے اس سے پہلے بھی کئی نئے نکور بچھڑے دیکھے تھے لیکن اس بار وہ اس بات پر حد سے زیادہ حیران تھی کہ بچھیا اور چینی عورت کی بچی ایک ہی وقت میں کیسے نمودار ہو گئے۔ اس نے اپنے باپ سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔

بچھیا اور نھنی بچی ساتھ ساتھ بڑے ہونے لگے لیکن لڑکی کے خیال میں بچھیا زیادہ خوبصورت تھی۔ چینی عورت اگرچہ بہت گوری تھی لیکن اس کی ناک بالکل چپٹی تھی اور آنکھیں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں اور وہ پنجاہن کے نزدیک بالکل خوبصورت نہ تھی۔ چینی عورت نے چھت کے ایک شہتر کے ساتھ لوہے کا ایک سپرنگ لٹکا یا اور اس میں ایک سا روگ لگا دیا۔ اس میں وہ اپنی بچی کو ڈال دیتی اور جھلاتی رہتی۔ بچی بڑی ہوتی گئی اور جب وہ چند مہینوں کی ہو گئی تو وہ مسکرانے لگی اور پیاری لگنے لگی۔ چینی خاندان میں ایک چینی دادا جان بھی تھے۔ یہ دادا جان جب بھی گھر لوٹتے بڑا نا شروع کر دیتے۔

چینی عورت تو خاموش رہتی صرف اس کا خاوند بڑے میاں کے ساتھ باتیں کرتا اور کبھی کبھار چلانے بھی لگتا۔ دادا بچی کی پیدائش کے بعد کچھ زیادہ ہی شور مچانے لگا تھا اور وہ چینی زبان میں جھڑکیاں دیتا رہتا جو دیوار کی دوسری جانب صاف سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھار بلند چینی شور کے بعد چینی عورت بچی کو گود میں لے کر ہولے ہولے رونے لگتی اور جب کبھی ایسا ہوتا لڑکی دیوار کی جھریوں میں سے جھانکتی اور عورت کو روتے اور ناک دباتے ہوئے دیکھتی۔

ایک روز دو ملائی عورتیں چینی عورت کے گھر میں آئیں۔ انھوں نے بھی کونور سے دیکھا، اسے اٹھایا اور اس کے رخساروں کو پیار سے انگلیوں سے چھوا اور اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہیں اور لڑکی دیوار میں سے یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ملائی خواتین چلی گئیں۔ وہ کچھ دنوں بعد دوبارہ آئیں۔ ان کے پاس کپڑوں کی ایک ٹوکری تھی۔ انھوں نے بچی کو نئے کپڑے پہنائے اور اسے ساتھ لے گئیں۔ لڑکی اس وقت گھر سے باہر تھی اور اس نے چینی عورت کو اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر روتے دیکھا۔ عورت کے ہاتھ خالی تھے۔ دادا جان گھر کے اندر بے پناہ شور مچا رہے تھے۔ ملائی خواتین نے بچی کو دیکھا اور پھر چینی عورت کی طرف مسکرا کر

دیکھا اور چلی گئیں۔ بچی کو وہ ساتھ لے گئیں۔ چینی عورت نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ لڑکی بھی بھاگتی ہوئی اپنے گھر میں چلی گئی اور وہاں دیوار کے ایک سوراخ میں سے اس نے دیکھا کہ ہمسائی بستر پر بیٹھی رو رہی ہے۔ پھر وہ اٹھی اور لوہے کے سپرنگ اور سارونگ کے خالی جھولے کو جھلانے لگی۔ خالی جھولا جھولتا رہا۔ وہ چلا رہی تھی اور کوئی گیت بھی گارہی تھی۔ پنجا بن نے کہا چینبوں نے اپنی چھوٹی بچی کو ملائی خواتین کے ہاتھ نوے ڈالر میں فروخت کر دیا ہے۔ پنجا بنی باپ نے کہا کہ اس کی بچھیا کے لیے کوئی بھی نوے ڈالر نہیں دے گا۔

چینی عورت اس روز اور اس سے اگلے روز بھی گھر سے باہر نہ نکلی۔ پنجا بن نے بتایا کہ وہ بیمار ہے اور جب لڑکی نے دوبارہ دیوار کے ایک سوراخ میں جھانک کر دیکھا تو چینی عورت بستر پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اپنے ہاتھ اپنی چھاتی پر باندھ رکھے تھے جیسے وہ درد میں مبتلا ہو۔ ہر رات سونے سے پیشتر لڑکی کو دیوار کے پیچھے سے لوہے کے سپرنگ کی آواز سنائی دیتی۔ وہ ہولے ہولے جھول رہا ہوتا۔ عورت اسے جھلا رہی ہوتی اور چلا رہی ہوتی اور سسکیاں بھر رہی ہوتی۔

لوسیلادی۔ ہوسیلوس  
(فلپائن)

## ظہور

اُسے اپنا جسم بدلتا ہوا محسوس ہوا۔ تقریباً ایک ماہ سے وہ اپنے آپ کو سمجھ نہیں پا رہی تھی کیوں کہ اُس نے اس طرح پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنا چہرہ دیکھتی، چھوٹے سے ریت کے کنویں میں اور وہاں پانی میں اُس کا جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ ہوتا۔ یہ ریت کانواں اُس نے دریا کے کنارے بنایا تھا اور اُسے پہاڑیوں سے دوڑ کر آئے والے برابر کر چکے تھے۔ اُس نے اپنے نقش تو بدلے ہوئے نہیں دیکھے لیکن اس کے باوجود وہ یہ کیوں محسوس کرتی ہے کہ اُس کے چہرے کا تاثر بدل رہا ہے۔ وہ اپنے ہی سوال کا جواب نہ دے سکنے کے باعث اُلجھی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی نگاہ باریوں کی طرف کی۔ دوپہر کی چمکتی دھوپ میں اُن کے گھر کی چھت کا پتہ نہ چلتا تھا۔ دریا کے ساتھ والی سڑک کو جانے والا راستہ صاف تھا لیکن اُن کے گھر کی جانب جانے والے راستے پر بے شمار گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ہل چلانے کے لیے اُس کا باپ جو کرا ہو استعمال کرتا تھا وہ ابھی تک کنویں کے پاس آم کے درخت کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اُنھوں نے کھیتوں کا کام ابھی مکمل نہیں کیا۔ اُس نے فراغت سے سوچا لیکن ساتھ ہی ساتھ کپڑے بھی دھوتی رہی اور اُنھیں جلدی جلدی نچوڑتی رہی کیوں کہ گرمی بڑھ رہی تھی اور والدین کی واپسی سے پہلے اُسے دوپہر کا کھانا بھی پکانا تھا۔ تقریباً سارا بار یوں کھیتوں میں ہل چلانے کے لیے گیا ہوا تھا اور وہ آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ابھی مارچ تھا لیکن دھان کاشت کے بعد موکھ گئی تھی اور اب



اُس کے سُوکھے ہوئے پودوں کو توڑنا پڑتا تھا۔ وہ لوہے کے پھالے سے کھیت کی زمین کے کلڑے ہوتے دیکھ سکتی تھی۔ اوپر ہی زمین اپنی گھاس پھوس کے ساتھ پلٹ جاتی تھی اور اُس سے ٹپٹی زمین سفید بھری بھری خاک میں بدل رہی تھی کیوں کہ گرمی سیاہ نمی کو چوس لیتی تھی۔ یہ سب کچھ ایک مرتبہ کنوئیں پر بیٹھنے والی عورتیں بتا چکی تھیں اور ایسے قہقروں کے ساتھ جو اُس کی سمجھ سے باہر تھے۔ زمین کو جڑی بوٹیوں اور کیڑے مکوڑے سے صاف کرنے کے لیے، جب کہ وہ خشک اور گرم موسم میں کھلی پڑی ہو، اپریل کی اکا دکا بارش کی بجائے بہتر ہے کہ مئی کی شدید بارشیں ہوں اور ان شدید بارشوں کو اُس نے یوں پہچانا تھا کہ ناریل کے پتوں اور کمانے کے چوڑے اور موٹے پتوں اور ان کے جوا لین چھیننے پڑتے تھے وہ گویا آسمان سے برکت کا نزول تھے، جیسا کہ بڑی بوڑھیوں نے بتایا تھا، تو پھر فصل بہتر ہوتی تھی۔ اُس کے ذہن پر خاموشی کے درمیان، ایسے خیالات اور احساسات چھائے ہوئے تھے جن کو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ جب وہ نیلے آسمان کو دیکھتی، جہاں اُس پادری کے بقول، جو ماہانہ وعظ کے لیے آتا تھا، اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے زمین پر اچھی زندگیاں گزاری تھیں، خدا اور فرشتوں کی نہ ختم ہونے والی خوشگوار رفاقت ہے،

تو سب سے زیادہ تنہا محسوس کرتی۔ اُس کے والدین نے اُسے یقین دلایا تھا کہ جو کچھ پادری نے کہا ہے وہ سچ ہے اور وہ دن بدن اُس سے دور ہو رہے تھے اور اب اُس کے لیے اُن سے کوئی سوال پوچھنا ناممکن ہو رہا تھا سوائے کا شکاری اور گھریلو معاملات کے۔

حال ہی میں وہ کچھ پوشیدہ قہقروں میں بہت سکون محسوس کرتی جو کنوئیں یا دریا پر کھڑی عورتوں کے ہوتے۔ وہ خاندانوں، بچوں، بیماریوں اور روزمرہ کی زندگی کے بارے میں باتیں کرتی چلی جاتیں۔ اب اُن کی غیر موجودگی میں وہ دریا پار کے بانس کے جھنڈوں کی آواز زیادہ غور سے سنتی۔ تتلیاں جو ادھر ادھر اُڑتی پھرتی تھیں اور لوم بوائے کی کلیوں پر بیٹھنے کی کوشش کرتی تھیں جو اُس کے لیے سایہ مہیا کرتا تھا، اُس کے خیال میں وہ اُسے سمجھنے اور درست بنانے کے لیے ایسا کر رہی تھیں۔ کانوں کو چیر دینے والی ناگوائی کی چیں چیں اُس کے دماغ میں اُترتی تھی، اور وہاں تک جاتی تھی جہاں ان کے خیال تھے۔ وہ اپنے انگوٹھوں کے ساتھ کھیلتی لہروں کے ٹھونے سے بے حساب لطف حاصل کرتی۔ وہ اس قدر اصلی تھیں اور اُن کی قربت کا خوشگوار احساس اس پر چھا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی اُسے اس کی احساس رہتا کہ وہ صرف اُن کی

موجودگی ہی میں اُن کو جان سکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُن کو یوں بھوکے بعد میں بھی اُنھیں یاد کر سکے، جس طرح وہ اپنے باپ کے چہرے کی نرمی کو یاد کر سکتی تھی!

ایک لمحے میں باپ کا تصور اُس کے ذہن میں آیا تو اُسے یاد آیا کہ اُس نے تو کبھی اُس کا چہرہ بھوئی نہیں تھا!

یہ اُسی کا چہرہ تھا جو سب سے زیادہ اثر رکھتا تھا: صاف ستھرا اور ایماندار ایک ایسی نگاہ جو اس کے خوبصورت دل کا حال سناتی تھی۔ اُسے اس کی نرمی بھی یاد تھی۔ پتلا ڈبلا لیکن مضبوط جسم کا وہ ایک مہربان اور اچھی خصلت رکھنے والا شخص تھا اور وہ اکثر اپنی ماں کی شکایت سنتی کہ تمام تکلیفوں کی وجہ وہی ہے۔ نیک دل ہونے کے باعث اُس کی ماں کہتی تھی، وہ اپنے زمیندار کے ساتھ بحث نہیں کرتا تھا اور وہ زمیندار فصل میں اُن کا حصہ مار لیتا تھا۔ ہم اُن کو اُس سے زیادہ کیوں ادا کریں جتنا کہ ہم نے اُن کا دینا ہے؟ اور پھر بڑے گھر میں بے شمار ایسے کام کیوں قبول کیے جائیں جن کے بارے میں پتا ہے کہ ان کا معاوضہ نہیں ملے گا۔ اُس کی ماں اس بات سے بے خبر تھی کہ ہمسائے اُن کے جھگڑے کا تماشا دیکھنے کے لیے صحن میں جمع ہیں۔ ماں چینی اور یوں چینی جیسے خاندان میں کوئی بیمار پڑ گیا ہے۔ اگر کبھی اُس کا باپ بحث کرتا تو صرف وقتی طور پر، اور فوراً ہی اس پر معافی مانگ لیتا چاہے اُن رامون کا اور سیر پابلو ہی کیوں نہ ہوتا۔ سنو اور سنو ریٹا رامون سیٹو: وہ نہ ہی کچھ بیان کرتا ہے اور نہ چھپاتا ہے۔ اپنے مالکوں کی موجودگی میں وہ ہمہ وقت احتقانہ طریقے سے مسکراتا رہتا ہے اور اپنا روری ہیٹ دبوچے رکھتا ہے۔ وہ صرف سر ہلاتا رہتا ہے اور اُسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اُس نے کیا کہنا ہے۔ کبھی کبھار وہ اپنی ماں کے غصے کو جائز سمجھتی لیکن جب وہ اپنے باپ کا چہرہ دیکھتی، جس پر غصے کا سایہ تک نہ ہوتا، نہ ہی نفرت اور نہ ہی کسی قسم کی تنگی تو وہ اپنے مالکوں کی طرف دیکھتی تاکہ کسی پر تہمت لگائی جاسکے۔ پھر اُس میں خوف اور فکر مندی کا لاوا اُبلتا جو اُس کے باپ تک پہنچتا۔ اور یہ کیسے ہوتا؟ اُسے کبھی پتہ نہ چلا۔ وہ اس بات پر بے حد جل بھن جاتی کہ ہمسائے اُس کے والدین کے جھگڑے سنتے ہیں، صرف اس لیے کہ یہ جان سکیں کہ اس دنیا میں اُن سے بھی زیادہ بد قسمت اور ناخوش لوگ موجود ہیں۔ اس کی پوری زندگی اُس کے گلے میں اٹکی ہوئی تھی اور نا آسودگی سے اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں کسی ایسی شے نے، جسے نام نہا نہیں دیا جاسکتا، ناقابل بیان اذیت اور فکر مندی اُس کے اندر بیدار کی۔ اُس کی بے چینی گھر میں اور کھیت میں عیاں تھی بلکہ جب وہ

بات کرتی تو بھی پتا چل جاتا۔

بہت ساری چیزیں اور خیال اُس کے ذہن میں رقص کرتے اور اُس کے خوابوں میں آتے لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو کیونو اور پانا ڈیوگنگ میں کنویں میں سے پانی بھرتے دیکھتی، دہقانی عورتوں کے ساتھ ہنستے ہوئے جب کہ وہ بانس کی لمبی نالی کندھوں پر رکھ رہی ہوتی، اس کے پیشتر کہ وہ کھیتوں میں گرم سورج تلے چلتی ہوئی گھر جائے۔ کاشت کے موقع پر دھان کی پیڑی گیلی اور بھاری ہوتی ہے اور پانی بھرے کچڑ میں اُترنے کی خواہش رکھتی ہے۔ اور مغرب کی طرف سورج کا سفر دھان کے پودوں کے سائے سے ناپا جا سکتا ہے۔ نومبر تک ہوا فصل کے پکنے کی مہک سے بھاری ہو جائے گی۔ اگیتا ماکان، جو پھلی پگ کے لیے بالکل مناسب ہوتا ہے، لیکن پالو وہاں اُنھیں یہ یاد دلانے کے لیے ہوتا تھا کہ ان کچی فصلوں کو پھلی پگ کرنے سے چوہوں اور کیڑوں کو ٹوڑوں کا خطرہ ہوتا ہے اور وزن بھی کم ہو جاتا ہے۔ بوڑھے لوگ اپنے سر پہلے سے بھی زیادہ زور زور سے ہلاتے۔ وہ کہتے: جب ہم نوجوان تھے تو رات کے کھانے کے بعد ہم گچکے سے چاندنی راتوں میں نکل جاتے تاکہ کچھ کئی کے پودے لاکر اُنھیں کوٹ کر پھلی پگ میں تبدیل کیا جائے اور یہ سب گچھ ہنستی مذاق اور گانے بجانے کے ساتھ ہوتا۔ اور سیر جانتے تھے یہ لوگ چاندنی راتوں میں نکل جاتے ہیں لیکن وہ ہمارے طرفدار تھے اور زمیندار کو کبھی نہیں بتاتے تھے۔ اور اب تو اور سیر زمیندار سے بھی زیادہ لالچی ہیں جیسے وہ خود زمین کے مالک ہوں۔ ذرا پالو کے گھر کو دیکھو۔ اُس کے بچے شہر کے مہنگے ترین سکول میں زیر تعلیم ہیں۔ دسمبر تک پکتے ہوئے بٹے غروب آفتاب کے وقت سونے جیسے سنہری ہو جاتے تھے۔ لیکن کٹائی اور کاشت میں دقت یہ تھی کہ ہمہ وقت وہ حساب ذہن میں رہتا جو بڑے گھر کی حساب کی کامیوں میں درج تھا اور اس محنت کے باوجود وہ بچوں کا ٹوں رہتا تھا۔ اگر ایک نیا خانہ نہ بنا یا گیا تو سائنٹو نیو کے پاس کرسمس پر چندہ دینے کے لیے بھی گچھ نہ ہوگا۔

اُس کے بکھرے ہوئے خیالات اُسے گیلے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس واپس لے آئے۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ مستقبل کو دیکھ رہی ہے لیکن کیا یہ حال نہیں ہے؟ ماضی تو اب بوڑھے لوگوں کی خیدہ کمر کی طرح اُن کی چٹھتی ہوئی تیز نظر میں ہے۔ چیزوں کا ہو بہو ہی ہونا اُس کے بدن کی تبدیلی کے احساس کو اور شدید کرتا تھا۔ اُسے اب معلوم ہوا کہ اُسے یکدم یہ احساس اس وقت ہوتا تھا کہ جب اُسے کوئی دیکھتا تھا۔ اُس نے یاد کیا کہ سان رفاکل کے جشن کے موقع پر

پچھلے مہینے کیا ہوا تھا۔ جب پکارنے والے نے جشن کی ملکہ کا شاعرانہ تعارف کروایا تھا:

ان ڈے۔

آم کے درخت کی طرح پتے نکالتی ہے۔

اُس کا بدن۔

ایک بھول کی طرح کھل رہا ہے۔

اُس نے اپنے آپ کو شاعری کی موسیقی میں گم کر دیا تھا، یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ سب کچھ اُس کے لیے کہا جا رہا ہے، چنانچہ اُس کے احساسات، اس کے بدن اور اُس کا عورت پن ان خوبصورت تعریفوں سے کھلنے لگا تھا۔ اُس وقت کے بعد اُسے پتا چلا کہ اُس کی آواز بدل رہی ہے اور وہ ایک ہی شے کو مختلف طریقوں سے دیکھتی تھی، مختلف چالوں سے چلتی تھی۔ اُس نے اپنے بالوں کا طرزِ آرائش بدل لیا تھا۔ اُس کے لباس جسم پر تنگ ہو گئے تھے۔ دوسروں کے پاس اتنا کچھ ہے تو میرے پاس اتنا کم کیوں ہے؟ پورا خاندان جتنی بھی کوشش کرتا، پورا گاؤں جتنی بھی محنت کرتا فصل زیادہ نہ ہوتی، اتنی ہی رہتی۔ بارش زیادہ ہو جاتی، سورج زیادہ جلاتا، بڑے گھر میں حساب کتاب بڑھ جاتا اور عورتیں زیادہ گہرے سانس بھرتیں۔

جیسے جیسے اُس کا ساتھی عورتوں اور چیزوں کو دیکھنے کا طریقہ بدل رہا تھا ویسے ہی

لوگ بھی اُسے ایک مختلف انداز سے دیکھتے تھے۔ اُس نے نوٹ کیا کہ نوجوان لڑکے اُس کی

طرف زیادہ دیکھتے ہیں اور دیر تک دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر بدھ کے روز، جو شہر میں خریداری

کا دن ہوتا ہے، اور وہ اپنے بہترین اور اکلوتے لباس میں ذرا بن ٹھن کے جاتی ہے۔ ایسے

اشاروں سے وہ پریشان ہو جاتی ہے اور وہ اپنی نگاہیں پھیر لیتی، شرمندگی اور خفت کی وجہ سے۔

اب اِس تنہائی میں اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنے والدین پر چیخے بلکہ ہمسایوں اور پوری دنیا پر تاکہ

انہیں معلوم ہو سکے اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن اُس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ دُور، بہت دُور

، دوپہر کی خیرگی میں اُن کا گھر جیسے اور دور ہو رہا تھا۔ اُس کے آس پاس تو مرجھائے ہوئے

پتے بھی نہیں سرسراتے تھے۔ سورج بہت اوپر آچکا ہے اور گرمی گنجدی گنجدی گنجدی ہوئی تھی اور

کچھ آبی پودے ابھی تک زندہ تھے۔ گرمی دریا کے پانی میں بھی سرایت کر چکی تھی اور لوم بوائے

کے سایے میں بھی اُس کی کھال میں پھمتی تھی۔ اُس نے سیٹی بجائی اور خوش ہو کر ہوا کو پکارا لیکن

ناریل اور کوگون کے پتے بھی ساکت تھے۔ اس نے ایک ناریل کے خول کی مدد سے اپنے بدن



اُس کا باپ بیچ پر گر گیا اور بڑی دیر تک کندھے جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ جھاڑو دیتی رہی تھی اور رامون سیٹو کی آمد کا راز اُسے سُست بنا تا تھا۔ اُس نے اپنے باپ سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیا چاہتا تھا کیوں کہ اُس نے اُسے بے حد بے دلی کے ساتھ اور آہستہ آہستہ بیڑھیوں پر چڑھتے دیکھ لیا تھا۔ ’’چھو کیا چاہتا تھا؟‘‘ اُس نے اپنی ماں کو کہتے سنا۔ لیکن اُس نے باپ کا جواب نہ سنا۔ لگتا تھا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

اُس نے سُوکھے ہوئے پتے اور آم اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے اُسے آگ لگا دی۔ اُس کا دل اور دماغ پرسکون ہو رہے تھے۔ اسی وقت اُس نے اپنے باپ کو گن گنک اور میال لیے باہر جاتے دیکھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا کیلے کے تھڈ کی طرف گیا۔ وہ بہت دیر تک کیلے کے ایک تنے کے سامنے گم سم کھڑا رہا اور بھاری بھاری سانس لیتا رہا۔

ایک دم اُس نے گن گنک کو نکال کر کیلے کے ایک درخت کو کاٹ دیا اور پھر چڑھے ہوئے سانس کے ساتھ اُس کے گلزے گلزے کر دیے۔ سفید سفید گودا ہر طرف اُڑنے لگا۔

اور اب بھی، دریا کے کنارے، اسے یاد تھا کہ وہ کتنی خوفزدہ ہو کر گھر کی جانب

بھاگی تھی، اپنی ماں کو پکارتی ہوئی اور پھر اُس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے صحن میں اپنے باپ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اُس کی ماں بھاگتی ہوئی اُس کے پاس نیچے چلی گئی۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے باپ نے کیلے کے تنے کو کاٹنا بند کر دیا ہے۔ وہ بانس کے گلزوں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور گن گنک کو احتیاط سے میان میں ڈال لیا۔ پینہ اُس کے چہرے سے بہتا تھا اور وہ یہ نہ جان سکی کہ شاید وہ بھی اُن کی طرح رورہا تھا۔ اُس نے ماں کو آنکھیں پونچھتے دیکھا۔

اُس کے والدین شام کو واپس اوپر آئے۔ اُس نے رات کے کھانے کے لیے

چاول بنا رکھے تھے۔ ایک نامعلوم کانٹے کی طرح خاموشی اُسے چمکتی رہی۔ اُس کا بدن کانپ رہا تھا اور وہ جاننا چاہتی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے لیکن اُس نے والدین سے استفسار نہ کیا۔

اُسے اندازہ تھا وہ جو گھمکھ رہے تھے ایک راز تھا۔ ایسا راز جو اُسے بتا دیا جائے تو بھی وہ

جان سکے! اُس کی ماں رات کا کھانا بنانے میں اُس کی مدد کرتی رہی۔ باہر اُن کی چھوٹی سی

بیٹھک میں اس کا باپ بانس کے بیچ پر آرام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھامس اور برنگ نے گھر

میں چھائی خاموشی کا احساس کیا اور کھانے کے بعد کوئی سوال پوچھے بغیر سو گئے۔

وہ اچھی طرح سے نہیں سو سکتی تھی۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ کیلے کے درخت کے

سفید چھلکے اُڑ رہے ہیں اور اُن پر چمکتی دھات کے دار ہو رہے ہیں اور پھر وہ رامون سیٹو کی سفید جلد میں بدل رہے ہیں۔ اُس نے اپنی نیند میں چابک کی آواز سنی اور سوسوں کی دھمک سڑک پر پڑتے ہوئے اُس کے کانوں میں اُتری۔ صُبح وہ دیر سے اُٹھی اور تنہا ناشتہ کیا۔ اُس کے والدین کھیتوں کو جا چکے تھے اور لڑکے بھینسوں کو چراگاہ میں چرا رہے تھے۔ پہلی بار اُس نے اپنی تنہائی محسوس کی۔ وہ چاہتی تھی اپنا خواب کسی اور کو سنائے۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ ٹیسا سا مانگ کو ملنے سا ماگ گئی جہاں املی کا ایک تناور درخت طوفان کی وجہ سے اکھڑا پڑا تھا۔ لیکن ٹیسا سا مانگ شہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی اور اپنے دروازے کے سامنے بس کا انتظار کر رہی تھی، وہ اپنی بہن کو ملنے جا رہی تھی جو اس لیے گھر سے بھاگ گئی تھی کہ اُس کی ماں نے اُسے شہر میں قسمت آزمائی کی اجازت نہیں دی تھی۔ بڑی بہن پلرا اب ایک لباس بنانے والی فیکٹری میں کام کرتی ہے اور رات کو سکول جاتی ہے۔ وہ ٹیسا سا مانگ سے پلر کی کہانیاں سُن کر بہت خوش ہوتی تھی۔ جو خوش حالی پلر کی منتظر تھی اُس کے خیال ہی سے اسے بھی بہت خوشی ہوتی تھی۔

کپڑے نچوڑتے ہوئے اُس نے پلر کے کام کے بارے میں سوچا کہ وہ کیا کرتی ہو گی: خود کمائی کرنا اور پھر سکول میں بہت سارے دوست بنانا اور شہر میں ہونا۔ جو وہاں گئے تھے کہتے تھے وہاں سکول اور سٹور بہت بڑے بڑے ہیں۔ سینما گھر، ریسٹوران اور بیوٹی پارلر خوب ٹھنڈے ہیں اور طرح طرح کے کھیل تماشے ہیں۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹیسا سا مانگ کو مل کر شہر کے بارے میں اور بہت کچھ پوچھے گی۔

اُس کے خیالات اس وقت بکھر گئے جب دریا کے پار بانس کے پودوں میں سے کچھ آوازیں آئیں۔ کچھڑے لت پت ایک بھینس بانس کے ٹھنڈے میں سے برآمد ہوئی۔ وہ سیدھی دریا کے کنارے گئی اور پانی پینے کے لیے رُک گئی۔ ایک بڑا پتھر اس کی پشت پر زور سے لگا۔ وہ کنارے سے ہٹی اور ایک گڑھے میں گر گئی۔ لنگڑاتی ہوئی وہ ناریل کے اُن درختوں کی طرف گئی جو کھیتوں کے ساتھ ساتھ تھے۔ جب وہ گڑھے میں گری تو دو پہر کی خاموشی میں ایک بلند تھقے کی آواز سنائی دی۔

جب اُس نے یہ آواز سنی تو ایک تیرسا اُس کے سینے میں اُترا اور کُچھ اُس کے بدن پر رینگنے لگا۔ خوفزدہ ہو کر اُس نے آس پاس دیکھا۔ اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ اُس کے والدین

پچھلے اتوار کی دوپہر کو کیا گفتگو کر رہے تھے اور اُس کے بعد اتنے روز چُپ کیوں رہے تھے۔ اُس کے ذہن کی تاریکی میں طرح طرح کے منور اور کئی سورج کی طرح روشن ستارے چمکنے لگے اور اندھیرا کم ہونے لگا۔ یہ روشنی اُس کے احساسات میں کھب گئی۔ اُس کے دماغ میں، نظر میں اور پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ اس نے اُسے عورت پن کا پہلی بار احساس دلایا۔ اس اندر کی روشنی نے اُس کی سوچ کو راہ دکھائی اور وہ اس راہ پر چل نکلی تاکہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکے۔

اُس نے آس پاس نگاہ کی۔ یہ علاقہ بالکل ننگا تھا اور وہاں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ اپنے آپ کو چھپا سکتی۔ لیکن اب وہ کچھ سمجھتی ہے اس لیے خوفزدہ نہیں ہے۔ اور اُسے علم ہے کہ اُس نے کیا کرنا ہے۔ دائیں جانب، ذرا نیچے، دریا قدرے گہرا ہے۔ وہ جلدی سے وہاں پانی میں کود گئی جہاں انیام کے درخت کی ایک ٹہنی ٹھکی ہوئی تھی۔ اب وہ سُوکھے پتوں کو کھینچتے ہوئے بوٹوں کی آواز سن رہی تھی جو راستے پر چلے آ رہے تھے۔ وہ ہراساں ہو کر پرواز کر جانے والے پرندوں کی پھر پھر اہٹ بھی سن سکتی تھی۔ ٹڈے بھدک رہے تھے اور تبتلیاں ادھر ادھر اڑتی جا رہی تھیں اور اب ٹہنیوں اور پتوں پر برستی چا بک کی آواز آ رہی تھی۔ کیا اُسے دیکھ لیا گیا تھا! شاید وہ بانسوں کے ٹھنڈے پوشیدہ ہونے کے باعث نظر نہ آئی ہو۔ لیکن کنارہ تو ننگا تھا اور گھاس اور پودے گرمی سے ٹھلس کر سُوکھ گئے تھے حالانکہ موسم گرما بھی شروع ہی ہوا تھا۔ جب اُس نے راستے پر چمکتے بوٹوں کو دیکھا وہ پانی کے نیچے چلی گئی۔ وہ وہاں کتنی دیر دم روکے ٹھہری رہی اس کے بارے میں اُسے کچھ علم نہ تھا۔ اُس کی چھاتی سانس لینے کے لیے پھٹی پڑی تھی۔ جب وہ برداشت نہ کر سکی تو سُرُخ پر آ گئی۔ گرچہ سورج چمک رہا تھا لیکن وہ اُسے سیاہ دکھائی دیا اور جب اُس کے اوسان بحال ہوئے تو اُس نے دیکھا کہ وہ بالکل اکیلی ہے۔ وہ کنارے پر چڑھ گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ بدن سے چمٹا ہو گیا لباس سُرُج کی آگ تلے بھی ٹھنڈک دے رہا ہے۔ وہ سُرُک کی جانب تیزی سے بھاگنے لگی۔ فٹ پاتھ سے جب وہ سُرُک کے تار کول پر آئی تو اُس نے پیچھے مُوکر دیکھا۔ اُس کا گھرا اور پورا گاؤں اس قدر چھپ رہے گئے تھے کہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر مُوے بغیر وہ ویران جنگل کے راستے سامباگ۔ کولوب کی جانب روانہ ہو گئی۔



کیترین ہم  
(سنگاپور)

## پوئے آہ موئے

آرین کے ساتھ ایک برس گزارنے کے بعد اس کی بے چارگی اور بے ہنگم پن ختم ہوئے اور پوئے آہ موئے اپنے مالک کو اپنی دکھ بھری زندگی کے بارے میں بتانے کے قابل ہو گئی۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھی اور کبھی سکول نہیں گئی تھی اور جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا وہ اپنے والدین کے چکن فارم میں ان کی مدد کیا کرتی تھی۔ یہ فارم چھوٹے سے گاؤں ’’ایس‘‘ میں تھا جو ہور بھارو کے نزدیک واقع تھا۔ اس کی ماں کو سانس کی تکلیف تھی اور وہ سارا دن بستر پر پڑی رہتی تھی۔ اس کے دونوں بڑے بھائی ہوش سنبھالتے ہی گھر سے بھاگ گئے تھے۔ وہ نہ صرف قسمت آ زمانے کے لیے گھر سے بھاگے تھے بلکہ وہ باپ کے قہر سے دور ہونے کے لیے بھی وہاں سے چلے گئے تھے۔ باپ کے بارے میں اس نے آرین کو بتایا کہ اس کی آنکھیں پل بھر میں سرخ ہو جاتی تھیں اور وہ ایک سخت گیر بد مزاج شخص تھا جس نے خاندان کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو ہمیشہ پیٹتا رہتا۔ ایک مرتبہ اس کی چھوٹی بہن کو ہسپتال لے جانا پڑا کیوں کہ اسے سر میں شدید ضرب آئی تھی۔ ماں بیمار تھی تو بھی اسے مار پڑ جاتی۔ پوئے آہ موئے کے ماتھے پر بھی ضرب کا نشان موجود تھا (جو وہ بالوں کو آگے کر کے چھپا لیتی تھی) اور اس کا باپاں کندھا اب بھی کبھی کبھار دکھتا تھا۔ ایک روز ناخوش اور وحشی بوڑھے نے جنگل میں جا کر اپنے آپ کو ایک درخت سے پھانسی دے لی۔ چند دنوں بعد ماں بھی مر گئی اور بچے اکیلے رہ

گئے۔

دونوں بھائی تھوڑی دیر کے لیے واپس آئے اور کچھ مالی مدد کی کیوں کہ سنگا پور میں دونوں کے پاس اچھی ملازمتیں تھیں۔ ایک تو عمارتیں بنانے کے کام سے وابستہ تھا اور دوسرا ایک الیکٹرانک کی فیکٹری میں کام پر لگا ہوا تھا۔ ایک بہن آہ کم، آہ موئے سے چھوٹی تھی۔ وہ جنازہ ٹھکانے لگتے ہی بھاگ گئی۔ آہ موئے، آہ کم کے بارے میں بہت سنجیدہ اور بہت ہی دکھی دکھائی دیتی تھی۔ آرزین کو یہ جان جانے میں دیر نہ لگی کہ آہ کم کسی بڑے قصبے کے چکلے میں کام کرنے کے لیے گھر سے بھاگی تھی۔

آہ موئے نے گھر کا انتظام سنبھال لیا۔ دو چھوٹے بھائی اور دو چھوٹی بہنیں اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس نے کچھ عرصہ قبل جو ہور بھارو کے ایک ریٹوران میں برتن صاف کرنے کا کام کیا اور اس دوران وہ ہر اتوار کو گھر واپس آ کر بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرتی۔ دونوں لڑکے سکول جاتے تھے اور لڑکیاں گھر کا کام کاج کرتی تھیں۔ فارغ اوقات میں وہ چھوٹے موٹے کام کر کے آہ موئے کی رقم میں کچھ اضافہ کر دیتیں۔ وہ پنساری کی دوکانوں کے لیے کاغذ کے لفافے بنا تیں۔ یا پھر باداموں کو رات بھر بھگو کر اگلی صبح چھلکے اتارتیں تاکہ تیل میں تلنے سے یہ بادام ذرا خشک ہو جائیں۔ پانچ سیر باداموں کے چھلکے اتارنے کا ایک ڈالر ملتا۔ آہ موئے نے کبھی اپنے ہاتھوں کے کھر درے ہو جانے یا ان پر چھالے پڑ جانے کی شکایت نہ کی اگرچہ وہ دیکھ رہی تھی کہ برتن دھونے کی وجہ سے اس کے ناخن اور جلد ہمیشہ کے لیے برباد ہو رہے ہیں۔ البتہ وہ اپنی چھوٹی بہنوں کے بارے میں بات کرتی تو آبدیدہ ہو جاتی۔ ان میں سے ایک کو تو ابھی سے سانس کی تکلیف تھی، اپنی ماں کی طرح۔ ان سب کی کل آمدنی بھی بہت کم، ناکافی اور ہمت شکن تھی۔ آہ موئے نے ایک رشتے دار کی نصیحت پر سنگا پور جانے کا فیصلہ کیا تھا جہاں گھریلو ملازموں کو دو گنی تنخواہ ملتی تھی بلکہ کئی مرتبہ تین گنا اور دیگر مراعات اس کے علاوہ تھیں۔

’جب وہ پہلی بار میرے ہاں کام کرنے کے لیے آئی تو‘ آرزین اپنی بہترین

دوست بی لنگ کو بتا یا کرتی، ’میں اسے ملازم رکھنے پر تیار نہ تھی۔ اس نے ایک صبح میرے دروازے پر دستک دی۔ یہ بہت ڈبلی اور لاغر تھی۔ اس زمانے میں مجھے وہ بیوقوف ملازمہ بہت تنگ کر رہی تھی، تم تو اسے جانتی ہو، وہی جو کبھی ڈاکٹرنگ کے ہاں کام کرتی تھی۔ تو جناب آہ چنگ جو تھی وہ ہمیشہ چھٹی ماگتی رہتی اور اکثر فون کر دیتی کہ اس کا بیٹا بیمار ہے اس لیے وہ نہیں آ سکتی

یا اس کی دادی مرگئی ہے یا ایسی ہی کوئی اور بات۔ بہانے پر بہانہ۔ اس صبح میں بے حد پریشان تھی کیوں کہ کینٹی کی دیکھ بال کرنے والا کوئی نہ تھا اور میں گھر کے فاضل کاموں کی وجہ سے بے حد تھک چکی تھی۔ چنانچہ میں نے اسے رکھ لیا اور صاف صاف بتا دیا کہ یہ عارضی نوکری ہے۔ یہ سن کر اس کا لاغز اور فاقدہ زدہ چہرہ دسکنے لگا۔ اس نے تنخواہ وغیرہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ وہ فوراً ہی کام میں جت گئی۔ میں بے حد حیران ہوئی کہ ایک ایسی لڑکی، جس نے کبھی گھریلو ملازمہ کے طور پر کام نہیں کیا تھا، اتنی ماہر کیسے ہوگئی۔ وہ فرش صاف کرتی، فرنیچر جھاڑتی، باغ میں بکھرے پتے سمیٹتی، کتے کی گندگی صاف کرتی۔ اور یہ سب کچھ وہ بنا کہے کرتے۔ مجھے تو بے حد حیرت ہوتی۔

مڑے کی بات یہ ہے کہ وہ سب کچھ بالکل خاموشی سے کرتی، بغیر آپ کے راستے میں آئے۔۔۔۔۔ بالکل بے آواز۔ تمہیں وہ ملازمہ تو یاد ہوگی، وہ ٹوچیو عورت جو بہت کھردری تھی اور جس کے دانت سونے کے تھے، وہ اتنا شور مچاتی تھی کہ سب کو پریشان کر دیتی تھی۔ میں نے بون سے کہا کہ تم اس لڑکی کو کام کرتے دیکھو اور ایک ہفتے کے بعد ہم دونوں میں اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ یہ لڑکی ایک خزانے سے کم نہیں۔

پوئے آہ موئے وہیں مقیم رہی۔ وہ خوش نظر آتی تھی اور اس کی صحت اور شکل دونوں بہتر ہو رہے تھے۔ آئرین نے تیزی سے اس کی تنخواہ بڑھانی شروع کر دی اس ڈر سے کہ وہ کہیں اور نہ چلی جائے۔ جب بچہ پیدا ہوا تو آئرین کا خیال تھا ایک سترہ برس کی لڑکی ایک چھوٹے بچے کی دیکھ بھال اچھی طرح سے نہ کر پائے گی۔ لیکن پوئے آہ موئے نے چپکے سے اس کے لیے اجازت مانگی اور یہ بھی درخواست کی کہ صرف کپڑے دھونے کا کام کسی اور کے سپرد کر دیا جائے۔

’تم یقین نہیں کرو گی کہ اس نے نہ صرف چھوٹے بچے کی بلکہ کینٹی کی بھی پوری دیکھ بھال کی۔ البتہ میں کبھی کبھار بچے کے لیے دودھ تیار کر لیتی تھی کہ وہ رات کو پی سکے لیکن باقی سب کچھ آہ موئے کرتی تھی۔ وہ بچے کو کھانا کھلاتی، اسے نہلاتی، بوتلوں کو گرم پانی سے دھوتی، اس کا کمرہ صاف ستھرا رکھتی اور اس کے ساتھ ہی وہ کینٹی کے لیے بھی وقت نکال لیتی۔ میرا کینٹی تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو میری نسبت اس کے ساتھ زیادہ چہنٹتا اور جہاں جاتی اس کے پیچھے جاتا۔ بعض اوقات تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے کہ اس کے پاس کھانے اور نہانے کے لیے بھی وقت نہ ہوتا تھا لیکن وہ بالکل پروا نہ کرتی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ بس ٹھیک ہے اور بالآخر سب کچھ ٹھیک ہو

جاتا۔ وہ گھر میں ہوتی ہے تو میں دفتر میں بے فکری سے بیٹھتی ہوں۔ کیرن کی طرح نہیں کہ ہر پانچ منٹ کے بعد گھر فون کر کے ملازمہ سے پوچھو کہ بچوں کو دودھ پلا دیا ہے کہ نہیں۔ سودا سلف لے آئی ہو یا نہیں۔ میں تو سب کچھ اس پر چھوڑ دیتی ہوں۔ وہ تو ہیرا ہے۔

آرین پوئے آہ موئے کی خوبیاں بار بار بیان کرتی۔ ایک تو وہ اس لڑکی کی جائز تعریف کرنا چاہتی تھی دوسرے وہ ان لوگوں پر ترس کھاتی جن کے پاس اتنی اچھی ملازمہ نہیں ہوتی۔

پوئے آہ موئے، آرین بڑے جوش سے کہتی، بڑی صاف ستھری ہے۔ وہ گھر کی ہر چیز کی مکمل صفائی کرتی ہے۔ کرسیوں کی پشت اور ان کا نچلا حصہ، میری ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کا پچھلا حصہ، بچوں کے کھلونوں کی شیلٹ، میرے نوادرات۔ اور تمہیں پیہ ہے کہ نوادرات کو صاف کرنا کتنا مشکل کام ہے کیوں کہ ان پر بہت بار یک کھدائی ہوتی ہے۔ وہ ایک تیلی پر کپڑا پلیٹ کر انھیں صاف کر لیتی ہے۔

آرین کی خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانہ نہ تھا جب مسز کو ان نے اپنی کابل ملازمہ کی عادتوں کے بارے میں اسے بتایا۔ وہ خوشی اور مسرت سے ہنستی جا رہی تھی۔ کناروں پر دودھ، کافی یا اوٹلین کے دھبے صاف دکھائی دیتے۔ اور ایک روز جب مسز کو ان نے موقع پر جا کر ہر شے کو جانچا پر کھا تو معلوم ہوا باورچی خانے کے دروازوں میں لال بیگوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ آرین کہنے لگی: ”میری آہ موئے تو باورچی خانے کو بالکل چمکتا دمکتا رکھتی ہے۔ بلکہ میں تو خود کچھ اتنی صاف ستھری نہیں ہوں کئی چیزوں کو ادھر ادھر رکھ دیتی ہوں لیکن آہ موئے انھیں فوراً اٹھا کر ان کی مخصوص جگہ پر رکھ دیتی ہے۔“

”تم بہت خوش قسمت ہو۔ ان دنوں ایک اچھا ملازم مل جانا تو بہت ہی حیرت کی بات ہے۔“ مسز کو ان نے کہا۔ ”میری ملازمہ تو ست ترین بھینس ہے جو ذرا سا بھی زیادہ کام نہیں کر سکتی۔ کسی مہمان کی وجہ سے ایک پلیٹ سے بھی زیادہ صاف کرنی پڑ جائے تو اس کا منہ لٹک جاتا ہے۔“

آرین ایک مرتبہ پھر آہ موئے کی خوبیوں پر روشنی ڈالنے لگی: کیسے وہ اپنی مرضی سے اپنے فرائض سے بڑھ کر کام کرتی تھی۔ آرین نے کھڑکی کے اس پردے کے بارے میں تفصیل بیان کی جو آہ موئے نے اپنی مرضی سے بنا کر دہاں لٹکا دیا تھا اور ٹیلی ویژن لائونج کے گدوں کے

لیے جو نئے غلاف اس نے بنائے تھے اور لڑکے کی نیکر پر جو ڈائلڈ ڈک اور کی ماؤس کے کارٹون اس نے کاڑھے تھے اور ایک اتوار کو جو اس کی چھٹی کا دن تھا اس نے ننھے لگی کے کھیلنے کے لیے ایک نرم سی بلی بنائی تھی۔

”پھر تو تم اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتی ہو گی؟“ اس کے ساتھ کام کرنے والی مسز چندرانے کہا۔ اور یہی وہ موقع تھا جب آئرین اپنی فراخ دلی کے کئی قصے سناسکتی تھی۔ صرف آہ موئے ہی نہیں بلکہ اس کے خاندان بھر کے بارے میں بھی۔ اس کے علاوہ جب اس نے آہ موئے کی تنخواہ کے بارے میں بتایا تو سبھی حیران رہ گئے۔ پھر اس نے اپنی بے شمار عنایتوں اور کرم فرمائیوں کے بارے میں بتایا: چینی نئے سال کے آغاز پر جو خوبصورت انگ پواسے تحفے کے طور پر دیا گیا، کپڑوں، جوتوں، میک اپ کا سامان اور چھوٹے چھوٹے تحفوں کا ذکر ہی کیا جو آہ موئے کو دن رات ملتے رہتے تھے اور کھانے کی وہ ایشیا جو آہ موئے کو اس کے بہن بھائیوں کے لیے اکثر ملتی رہتی تھیں۔

”اور جہاں تک خوراک کا تعلق ہے،“ آئرین نے جان بوجھ کر اپنی سخاوت کا ذکر چھیڑا، ”وہ سبھی کچھ کھاتی ہے جو ہم کھاتے ہیں بسکٹ، شربت، کیک اور پھل وغیرہ اور ہاں سینون پر بھونا ہوا گوشت بھی۔ لیکن آہ موئے بہت شرمیلی ہے اور خود سے کوئی چیز نہیں لیتی اور ہمیں اکثر اصرار کرنا پڑتا ہے۔ اور اب جو تم لوگ اسے اتنا صحت مند دیکھ رہی ہو تو ذرا تین برس پہلے دیکھتیں جب یہ ملازمت کی تلاش میں ہمارے یہاں آئی تھی۔ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ اب تو خیر بہت خوبصورت ہے۔ اس کے بال اور رنگت بہت بہتر ہو گئی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس کے چہرے پر تھوڑا سا میک اپ کر دیا، میرا خیال ہے اس روز یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی تھی۔ یقین کر دے اتنی زبردست لگ رہی تھی کہ کیا بتاؤں! یہاں تک کہ بون نے بھی خاص طور پر تعریف کی۔ اور جب میں نے اسے بتایا کہ بون نے کیا کہا تھا تو یہ باقاعدہ شرماتا گئی تھی۔“

آئرین نے اعتراف کیا کہ اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ آہ موئے کی شادی ہو جائے گی۔ عام طور پر یہ لڑکیاں جوانی میں شادی کر لیتی ہیں اور آہ موئے تو انیس برس کی ہو چکی تھی۔ ایک چچی اس کے رشتے کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ لڑکا ایک چھوٹے سے کاروبار کا مالک ہے۔ لیکن میں نے اپنی آہ موئے کا ذہن بدل کے رکھ دیا ہے۔ آئرین نے پورے یقین

سے کہا ”میں نے اسے کہا ہے کہ یہ بیوقوفی مت کرنا۔ ذرا اپنی سہیلیوں کو دیکھو جو سولہ سترہ برس کی عمر میں شادی کر بیٹھی تھیں۔ وہ بچے پر بچہ پیدا کر رہی ہیں اور ان کے سرال والے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے ہیں۔ بیس برس کی عمر میں وہ چالیس کی لگتی ہیں اور ان کے پاس اپنا ایک دھیلا بھی نہیں۔ ذرا آہ کھم کو دیکھو جس نے چچی گھو کی ملازمت چھوڑنے کی حماقت کی تھی۔ اب وہ اتنی موٹی اور بھدی ہے اور اس کے تین بچے ہیں اور چوتھا بھی آرہا ہے۔ اگلے روز ملاقات ہوئی تو بہت بُرے حال میں تھی اور میں نے ترس کھا کر اسے پانچ ڈالر دے دیے لیکن تم تو اچھی بھلی خوشحال ہو۔ تمھاری تنخواہ بہت اچھی ہے اور تمھیں اس میں سے کچھ بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا کیوں کہ جو کچھ تمھیں چاہیے وہ سب یہاں سے مل جاتا ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تمھاری کتنی سہیلیوں کے پاس اتنے پیسے ہیں اور اتنا آرام ہے؟ اس کے علاوہ تم ابھی نوجوان ہو۔ فی الحال کام کرتی رہو۔ شادی کرنے تک تمھارے پاس خاصی رقم جمع ہو جائے گی۔ پھر تمھارے سرال والے تم سے نفرت نہیں کریں گے۔“

”اور وہ میری نصیحت پر عمل کر رہی ہے“ آئرین نے جیسے اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

”وہ اس سبزی والے کو گھاس نہیں ڈال رہی جو سبزی فروخت کرنے کے بعد اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ بس پانچ برس تک آہ موئے میری پاس رہ جائے۔ پھر میرے بچے بڑے ہو جائیں گے۔“

مسز کوان نے بڑے طریقے سے ایک مشورہ دیا کہ کہیں آہ موئے اپنی اہمیت کو جانتے ہوئے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ مسز کوان ایک ایسی ملازمہ کو جانتی تھی جو اپنی اہمیت سے بخوبی واقف تھی اور ہر ماہ کسی نہ کسی بہانے ملازمت چھوڑ جانے کا ارادہ ظاہر کرتی تھی اور اس کے نتیجے میں یا تو اس کی تنخواہ بڑھائی جاتی یا پھر تحفے تحائف دئے کر اسے روکا جاتا۔

”نہیں نہیں میری آہ موئے ایسا نہیں کر سکتی“ آئرین نے بھڑک کر کہا ”وہ تو تنخواہ

میں اضافہ کا مطالبہ نہیں کرتی اور اگر میں ایسا کرتی ہوں تو یہ سرسرمیری اپنی مرضی ہوتی ہے۔

صرف ایک بار ایسا ہوا کہ اس نے یہاں سے جانے کے بارے میں سوچا تھا۔“

آئرین کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔ ”اور یہ آہ موئے کی وجہ سے نہیں بلکہ میری

ساس کی وجہ سے تھا جو ہمارے یہاں رہنے کے لئے آئی تھی اور پہلے دن سے ہی ہر ایک کے لیے

مصیبت کا باعث بن گئی تھی۔‘

’وہ بڑھیا تو بس حد ہی کر دیتی تھی۔‘ آزرین نے چیخ کر کہا ’’وہ میری آہ موئے کی زندگی جہنم بنا دیتی تھی۔ ہمیشہ اس میں کیڑے نکالتی رہتی، اسے ڈانٹتی رہتی، اس کی جاسوسی کرتی رہتی اور آخر کار آہ موئے سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا اور وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں جانا چاہتی ہوں۔ میں تو گھبرا گئی اور میں نے بڑھیا کی خوب خبر لی۔ اور تم جانتی ہو اس نے آہ موئے کو کیا کہا؟ ناگن! بڑھیا نے آہ موئے کو ناگن کہا اور مجھے اس سے خبردار رہنے کے لیے کہا اور پتہ نہیں کیا کیا بکتی رہی۔ اور اس دوران اس نے وہ تمام چینی محاورے اور فقرے استعمال کیے جنہیں سن کر میرے روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے تو اسے چلی جانے کے لیے کہہ دیا۔ میں نے اپنے خاوند کے ساتھ بات کی اور یہی فیصلہ ہوا کہ بڑھیا کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ وہ کہیں اور جا کر رہے۔ میری طرح میرے خاوند کا بھی آہ موئے کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ لیکن مجھے معلوم ہے آہ موئے کی آمد سے جو خوشگوار تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں انہیں وہ بہت پسند کرتا ہے۔ پہلے وہ بچوں کے بارے میں بڑا تارہتا تھا اور اسے کھانے کے بارے میں بھی شکایت رہتی تھی لیکن اب تو وہ ہمیشہ اچھے موڈ میں ہوتا ہے۔ آہ موئے کی برائی کرنے والی صرف وہ بڑھیا ہے لیکن اس کا ذکر ہی کیا۔‘ اور آزرین اپنی ساس کے بارے میں اس سے زیادہ گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔

ایک اتوار کو، جو آہ موئے کی چھٹی کا دن تھا، وہ آزرین کی درخواست پر اپنے گھر نہیں گئی کیوں کہ یہ دن وہ اپنی کچھ سہیلیوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ ایک فیشن شو منعقد ہو رہا تھا اور اس کے بعد دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنی ایک ایسی ہم جماعت کے گھر جا رہی تھی جس نے ایک انتہائی امیر انڈینیشن کاروباری سے شادی کر رکھی تھی اور اب سنگاپور کے اعلیٰ ترین علاقے میں رہتی تھی۔

یون نے بے حد فراخ دلی سے بچوں کو چڑیا گھر لے جانے کی حامی بھری تھی لیکن یہ تو زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کا کام تھا اس لیے بقیہ دن کے لیے اسے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے آہ موئے کی ضرورت تھی۔

’خدا حافظ، میرے بچو۔ پھر ملیں گے۔‘ آزرین نے خوش دلی سے دونوں بچوں کو چوماد اور بچوں نے اس کی ذرہ برابر پر دانہ کی۔ بڑا تو یہ دیکھ رہا تھا کہ چھوٹے کی کرسی کو کب تک

جھنجھوڑا اور دھکیلا جا سکتا ہے یہاں تک کہ وہ چیخیں مارنے لگے۔ چھوٹا یہ سوچ رہا تھا کہ کون سا لمحہ مناسب رہے گا جب وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگے اور سب لوگ دوڑے آئیں اور پوچھیں کہ ادھو، آپ کو کس نے مارا ہے؟ جلد ہی چیخیں بلند ہونے لگیں اور یہ اس کے ننھے منے جسم کی مناسبت سے کافی طاقت ور چیخیں تھیں۔ آہ موئے بھاگتی ہوئی آئی۔ آئرین نے کار میں سے مسکراتے ہوئے کہا:

’بیارے بچو، دیکھو اب جھگڑنا نہیں۔۔۔۔۔‘ اور پھر کار کو تیزی سے چلاتی ہوئی چلی گئی۔ بون نے اتوار کے اخبار اور صبح کی کافی سے سراٹھاتے ہوئے کہا۔ ’کینی تم کی کو تنگ کرنا بند کر دو۔‘ اور اس کے بعد پھر اخبار پر جھک گیا۔

چھوٹے بچے کو کرسی سے اٹھا کر آہ موئے نے اسے چکارا اور پھر بڑے بچے کو جھوٹ موٹ تھپڑ مار کر صورت حال معمول پر لوٹائی۔ جلد ہی آہ موئے نے دونوں بچوں کو صاف ستھرا بنا کے فرش پر کھینٹنے کے لیے چھوڑ دیا۔

بون ابھی تک اخباروں میں محو تھا۔ آہ موئے ناشتے کی میز کے گرد منڈلاتی رہی۔ کبھی یہ اٹھا اور کبھی وہ شے صاف کر لیکن وہ کچھ نہیں رہی تھی۔ سادہ سوتی لباس اور میک اپ کے بغیر بھی آہ موئے خوش شکل لگ رہی تھی۔ انیس برس کی عمر میں اس کا جسم بھر چکا تھا اور اس کی جلد صحت اور جوانی سے دکھتی تھی۔ اس کے چہرے کا تاثر فرمانبرداری اور جھینپون کی بجائے ایک شرمیلے شعور میں بدل چکا تھا۔ آہ موئے کے گال سرخ ہوئے، اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ حالانکہ وہ اس وقت فرش کو دیکھ رہی تھی۔ وہ میز کے گرد منڈلاتی رہی اور اپنے مالک سے دریافت کرتی رہی کہ اسے اور کافی کی ضرورت تو نہیں۔ بون نے اوپر دیکھا، تھوڑا سا بچپنچا یا اور پہلو بدل کر کہنے لگا: ’’نہیں شکر یہ‘‘ اور پھر اخباروں میں گم ہو گیا۔ وہ کمرے میں پھرتی رہی۔ کھن کی تھالی کو ایک طرف رکھا۔ ایک کانٹے کو قالین پر سے اٹھایا۔ الماری پر رکھے گلڈان کے پھول دوبارہ ترتیب دیے۔ اگرچہ ان حرکات کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا لیکن تاڑنے والا تاڑ سکتا تھا کہ ہر حرکت جان بوجھ کر کی جا رہی ہے۔ آنکھوں میں ایک خاص چمک اور جذبے کی ایسی شدت اس شخص کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی جس کے لیے وہ پیدا کی جا رہی ہو۔ وہ شخص بدھو ہو تو بھی اسے یہ احساس ہو کر رہے گا کہ یہ سب اسی کے لیے ہے۔ اور اگر وہ ایک بھر پور اور صحت مند مرد ہو اور پینتالیس برس کا ہونے کے باوجود زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ رکھتا ہو تو اس



پران حرکات کا انتہائی خوشگوار اثر ہوگا۔

بون اپنی کرسی پر سے اٹھا۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ وہ بیک وقت خوش بھی ہوا تھا اور اس صورت حال کا چمکا بھی لے رہا تھا۔ کچھ عرصہ سے اس نے اس گھریلو ملازمہ کے چہرے کے تاثرات اور بولنے کے انداز میں ایک واضح تبدیلی محسوس کی تھی اور یہ تھی ہوتا تھا جب وہ تنہا ہوتے تھے۔ یک دم اسے یاد آیا کہ ایک روز اس کی ماں نے اسے خبردار کیا تھا کہ آہ مومے ایک گہری خطرناک عورت ہے۔ اس کی گہرائی اور خطرناکی اسے بالکل پریشان نہیں کر رہی تھی اور وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ پینتالیس برس کی عمر میں جن تو نکل رہی ہو اور ماٹھا پھیلتا جا رہا ہو تو ایک خوش شکل انیس سالہ لڑکی کا مانس ہونا یہ احساس دلاتا ہے کہ ہم اب بھی دلکش ہیں۔ اگرچہ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ خوش تھا۔ اس سے اس کی انا کو تسکین ملی تھی۔ اسی لیے ایک دعوت میں جب ایک دوست نے کہا کہ ہم سب اب پچاس پینے میں ہیں اور وہ لنگے نوجوان نہیں رہے جو کبھی تھے تو اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا: ”لیکن ایک بوڑھا شخص بھی تو نوجوان اور پیاری چیزوں کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے۔ کم از کم میں تو یہ جانتا ہوں کہ میری انیس سالہ آہ مومے مجھے پیار بھری نظروں کے ساتھ تکتی رہتی ہے۔“

اس کی بیوی جو ساتھ والی ٹولی میں کھڑی تھی، فوراً اس کے پاس آگئی تاکہ ہنسی مذاق میں شامل ہو سکے۔ وہ بڑے زبردست موڈ میں تھی اور آدھے گھنٹے تک اپنے گرد جمع ”خبیث بوڑھوں“ کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ وہ آہ مومے کو نوکری سے نکال دے گی اور آئندہ صرف ادھیڑ عمر ملازمہ رکھے گی جو موٹی ہو اور اس کی آواز کراخت اور بلند ہو اور دانت سونے کے ہوں۔ اس پر ایک زوردار تہقہ پڑا۔

اگرچہ بون اپنی بیوی کی پُر لطف باتوں پر مسکراتا رہا تھا لیکن ذاتی طور پر وہ کچھ متفکر تھا گو پریشان نہیں تھا۔ نوجوان لڑکی سینکڑوں حیلوں بہانوں سے اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بون اس کی انا کی تسکین ہوتی تھی۔ وہ بالکل فکر مند نہ تھا۔ یہ تو اس کے زندگی گزارنے کے طریقے کے عین مطابق تھا کہ آرام اور عیش سے اپنی انا کی تسکین کی جائے۔ ہر شام وہ اپنے کلیٹک سے ایک منافع بخش اور مصروف دن گزار کر واپس آتا تاکہ اس کی بیوی بچے اور آرام دہ گھرا سے راحت دیں۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو ہر لحاظ سے خوش تھا۔

آہ موئے نے میز پر سے ناشتے کی چیزیں سیٹھتے ہوئے پوچھا اور اس دوران اس کا پورا وجود اس شخص کے چہرے اور آواز میں اپنے لیے اپنائیت تلاش کرتا رہا جسے دیکھ کر پہلے ہی دن وہ متاثر ہوئی تھی اور اب چوری چھپے اس کی پرستش کرتی تھی۔ ’’چچی کیا کہہ کر گئی ہیں کہ بچے کتنے بچے چڑیا گھر جائیں گے، چچا؟‘‘ وہ ہمیشہ اسے ’’چچا‘‘ کہہ کر مخاطب کرتی لیکن اسے صرف ڈاکٹر جان سمجھتی۔ اس کی بیوی کی موجودگی میں وہ کبھی اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ اس کا سوال اپنی تمام تر خفیہ علامتوں کے ساتھ اس پر ظاہر ہوا۔ دو گھنٹے وہ بلا روک ٹوک تنہا ہوں گے، بچے ہوں گے، چار سالہ کہنی اور دو سالہ لکی اور چڑیا گھر کے جانور لیکن یہ پہلی بار ہو گا کہ وہ آئرین کے بغیر ہوں گے۔ اب مذاق مذاق نہیں رہا تھا۔ اس صورت حال میں کسی ایسی چیز کا اضافہ ہو چکا تھا جس کے بارے میں یون کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا ہے۔

آہ موئے نے بچوں کو تیار کیا۔ پھر وہ کپڑے بدلنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور جونہی یون نے بات کی آہ موئے اس کی آواز کی شدت سے جان گئی کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ بات چیت انگریزی میں ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غصے اور بے چینی کے آثار ظاہر ہونے لگے کیوں کہ اسے خیال تھا فون کرنے والا اس کے مالک کو کہیں اور جانے کی دعوت دے رہا ہے۔ اس نے یون کو پُر اشتیاق لہجے میں ’’ہاں ہاں‘‘ کہتے سنا اور جونہی اس نے فون رکھا آہ موئے کچھ جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

’’مجھے کہیں اور جانا پڑ گیا ہے۔‘‘ اُس نے آہ موئے سے نظریں چراتے ہوئے بے

چینی سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ جب اُس نے نظریں اٹھائیں تو اس نے دیکھا گلابی فراک میں وہ بہت دل کش دکھائی دے رہی تھی اور لباس کا رنگ اُس کی رنگت پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ اُس کی چمکتی آنکھیں مسکارا اور پنسل کے استعمال کی وجہ سے بہت خوبصورت ہو گئی تھیں۔ اُس کے بال گنگھر یا لے تھے۔ وہ ایک بھر پور عورت تھی۔ ذہانتی ہی خوبصورت اور پرکشش لگ رہی تھی جتنی فیشن شو میں شرکت کرنے والی ماڈل لڑکیاں یا رسالوں کے سرورق پر چھپنے والی عورتیں ہوتی ہیں۔ آہ موئے مسکرائی۔ یون کپڑے بدلنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا اور تیار ہو کر چلا گیا۔ ہاں جانے سے پیشتر اُس نے کہا: ’’مجھے افسوس ہے ہم چڑیا گھر نہیں جاسکے‘‘ یہ اس نے اس طرح کہا جیسے صرف وہ دونوں ہی جا رہے تھے اور بچوں کا اس میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ آہ موئے پھر مسکرائی اور کہنے لگی: ’’کوئی بات نہیں۔‘‘ لیکن مایوسی کو وہ پرچھائیں، جو اس کے



خاندن بھی اُس سے بے حد محبت کرتا تھا اور ہمیشہ اُس کو بے شمار پیسے دیتا تاکہ وہ چیزیں خرید سکے یا ماہ جوگ کھیل سکے۔ آہ موئے نے انھیں کتنی مرتبہ دیکھا تھا جب اُن کے بیڈروم کا دروازہ اتفاقتاً کھلا رہ گیا تھا۔ اور جس طرح خاندان سے چھیڑتا تھا اور پکڑتا تھا اور جس طرح وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی تھی اور اُس کے ساتھ کھیلتی تھی اس کو یاد ہے۔ وہ شدید حسد میں ممتلا ہو جاتی۔

کارکی آواز سن کر آہ موئے تیزی سے اٹھی، اُس نے کواکولا کا گلاس میز پر اور چھوٹے بچے کو لہے پر رکھا اور بڑے بچے کو جلدی سے کمرے سے باہر لے آئی۔ وہ پورا ایک منٹ بچوں کے ساتھ خوش خوش کھیلتی رہی تب اُن اندر آیا۔ وہ کچھ شرمندہ سا تھا جب اُس نے کہا: ”میں اپنے دوست کو ملنے کے لیے نہیں جا رہا۔ وہ مصروف ہے۔ اب میں بچوں کو چڑیا گھر لے جا سکتا ہوں۔ ان کو تیار کر دو۔“

”بچو، چلو آؤ، اپنے بھوتے پہنو۔“ آہ موئے نے آہستہ سے کہا اور وہ روشنی جو اُس نے رخساروں پر آئی اور وہ چمک جو اُس کی آنکھوں میں تھی ہٹھپائے نہ چھپتی تھی۔ لڑکے اپنے بہترین کپڑوں میں تھے اور اُن کو رنگین باتیک ٹوپیاں پہنائی گئی تھیں۔ آہ موئے نے انھیں کارکی کچھلی سیٹ پر بٹھایا اور پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ جب کبھی سارا خاندان باہر جاتا تو ایسے ہی سب لوگ بیٹھتے۔ آئین اور اُس کا خاندان انتظار کرتے اور وہ بچوں کو لے کر کچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتی اور دوران سفر وہ ان کی ضروریات کا خیال رکھتی اور اُن کو بہلائے رکھتی۔ اب لڑکوں نے لڑنا شروع کر دیا اور بڑے نے چھوٹے کو تھپڑ مار دیا۔ باپ نے سختی سے کہا: ”کتنی تم بڑے شرارتی ہو۔ تم پیچھے بیٹھو گے اور آہ موئے کی کو لے کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گے۔“ آہ موئے کے چہرے پر ایک نرم روشنی پھیلی جس سے وہ اور بھی زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ اس نے بڑی فرمانبرداری سے بچے کو اٹھایا اور اگلی سیٹ پر براجمان ہوئی۔

”اب ہم تیار ہیں۔“ ڈاکٹر چان نے ذرا مسخرے پن سے کہا اور کار چلا دی۔

آئین، جس نے پچھلے چھ مہینوں میں پندرہ پونڈ وزن کم کیا تھا کیوں کہ میک اپ اُس کے چہرے کی جھریوں اور چھائیوں کو چھپانے میں ناکام رہا تھا، اُس کی سہیلی بی لنگ نے اُسے گرم گرم چائے یا کافی پینے کے لیے کہا کیوں کہ وہ بہت بے چین لگ رہی تھی اور اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔ شکر یہ لنگ۔۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں صرف

تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں تاکہ اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔ اگر میں نے کسی سے بات نہ کی تو میں چیختے لگوں گی اور پاگل ہو جاؤں گی۔ کس کو یقین آ سکتا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے۔ لنگ۔۔۔۔۔ اور میرے ساتھ؟ جیسا کہ میں نے شروع میں تمہیں بتایا تھا میں نے اُسے نوکری سے نکال دیا تھا۔ سامنے رہنے والی مسز لائی کے الزامات میں برداشت نہ کر سکتی تھی اور ظاہر ہے کہ اس میں کچھ توجیح ہوگا ورنہ وہ ایسا کیوں کرتی؟ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے تمہارے خاوند کو معمول سے پہلے آتے دیکھا۔ وہ عام طور پر تو ایسا نہیں کرتا؟ اور اُسی سانس میں اُس نے کہا تھا کہ تمہاری آہ موئے کچھ بدلی بدلی سی نظر آتی ہے۔ وہ خوب میک اپ کرتی ہے اور بڑی خوبصورت لگتی ہے۔ میں نے بعد میں یون سے پوچھا اور بہت ہی سرسری انداز میں کہ وہ کلینک سے اتنی جلدی کیوں آ گیا ہے حالانکہ یہ اس کا معمول تو نہیں ہے تو وہ کہنے لگا کہ وہ کچھ بھول گیا تھا۔ میں نے کہا کہ تم نے وہ چیز لانے کے لیے احمد کو بھیج دیا ہوتا تو وہ لاجواب سا ہو گیا۔ میں نے زیادہ پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی تو وہ بے چین ہو گیا۔ میں اُن دونوں پر نظر رکھ رہی تھی لیکن میرا خیال ہے لڑکی بہت چالاک تھی اور وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی۔ جو کچھ مجھے کہنی نے بتایا وہ تو آخری پنک ثابت ہوا۔ تم جانتی ہو کہ میرا کہنی کتنا سمجھدار اور ہوشیار بچہ ہے! وہ اپنی ریل گاڑی کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ بغیر کسی وجہ کے ایک دم کہنے لگا: ’ڈیڈی کو چاچا سے پیار ہے۔‘ یا اسی قسم کا کوئی فقرہ۔ میں نے فوراً اُس سے پوچھا کہ اس نے یہ کیا کہا تو وہ کچھ خوفزدہ اور دل برداشتہ سا ہو گیا اور سر ہلانے لگا۔ ظاہر ہے اُس کو دھمکیاں دی گئی تھی اور اُس کے دماغ میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ اُس نے کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ میں نے اُسے بہتر ابھلا یا پھسلا یا، اُسکیا اور خوفزدہ کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ کہنی چھوٹا تھا۔ اب تم ہی بتاؤ لنگ اس صورت حال کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اتنے عرصے میں وہ چھٹال میرے ٹبر پر اثر انداز ہو رہی ہے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ ایسی فریبیں! اور تم نے تو اُسے دیکھا ہے، کیسی کم عمر، نرم اور معصوم نظر آتی ہے۔ میں نے تو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سبق سیکھ لیا ہے۔ میں نے اُسے نوکری سے نکالتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ میں نے اپنی ملازمت چھوڑ دی ہے اس لیے مجھے اب اُس کی ضرورت نہیں رہی۔ تم ذرا اُس کا چہرہ دیکھتیں۔ اُس پر میرے لیے کتنی نفرت اور حقارت تھی۔ بالآخر وہ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گئی۔ میں نے اُسے ایک ماہ کی تنخواہ زیادہ ادا کر دی تاکہ اُس کے پاس شور مچانے کا جواز باقی نہ رہے۔ اُس کے بھائی کچھ بد معاش سے لگتے ہیں۔‘

آزین یہ بھید صرف بی لنگ کو بتانا چاہتی تھی لیکن دل اور دماغ کا غبار ہلکا کرنے کے لیے اُس نے دھوکے باز اور فریبی ملازمہ کے بارے میں اُسی زور شور سے بولنا شروع کر دیا جس طرح کسی زمانے میں وہ اُس کی خوبیاں بیان کیا کرتی تھی۔ اُسے اب وہ تمام چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آ رہے تھے جو اُس لڑکی کے فریب اور چالاکا کا ثبوت تھے۔

”بظاہر وہ میرے بچوں کے ساتھ بڑی محبت جتاتی تھی۔“ آزین نے کہا۔ ”شکوہ شکایت کے بغیر وہ اُن کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ اور یہ سراسر ایک ڈھونگ تھا تاکہ وہ اس کے بغیر رہی نہ سکیں۔ اور ہر بار مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ ملازمت نہ چھوڑ جائے اور میں اس کی تنخواہ بڑھا دیتی۔“

آزین کے لیے اس گہری چال کا بھلانا ناممکن ہو گیا تھا۔ ”وہ میرے سامنے کتنی اچھی، خوش مزاج اور جی جان سے خدمت کرنے والی نظر آتی تھی لیکن میری پیٹھ پیچھے اس دوران میں سارا وقت وہ مجھ سے میرا خاوند چھین لینے کے منصوبے بنا رہی اور میرے بچوں پر ظلم ڈھاتی رہی کہ وہ بول نہ سکیں۔“ بے اختیار ہو کر وہ چلانے لگی۔

”ابھی سنگ دل اور بے جس! اور میں نے اُس کے لیے کیا نہیں کیا؟ اسے تنھے دیے، اس کی خبر گیری کی، اس کے گھر والوں کو تنھوں سے نوازا۔ کوئی یقین کر سکتا ہے کہ اس دنیا میں ایسے ناشکرے بھی رہتے ہیں۔“

”میری ساس درست ہی کہتی تھی،“ آزین نے انتہائی بے چارگی سے کہا، ”اس نے مجھے بروقت خبردار کیا تھا کہ آہ مومے ناگن ہے۔ لیکن میں اتنی اندھی ہو چکی تھی کہ میں نے اُس کی بات کا اعتبار نہ کیا اور اُس کے ساتھ لڑائی کر لی۔ میرے گھر میں ایک ناگن تھی اور میں اُس کے وجود کے بارے میں لاعلم رہی۔ یہ بوڑھے لوگ اُن چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں جن پر ہماری نظر نہیں جاتی۔ لنگ، میں تو ہر شے سے تنگ آ گئی ہوں۔“

اُس کی سہیلیوں نے اُس کی دل جوئی کی اور یاد دلا لیا کہ جس نے مصیبت کھڑی کی تھی اُسے تو رخصت کر دیا گیا ہے اور ایک مرتبہ پھر سکون اور امن کا دور دورہ ہے اس لیے اب بے چین ہونے یا اُس کے بارے میں باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔۔

”مجھے کچھ یقین نہیں ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا سوچوں لنگ۔“ آزین نے بے چارگی سے کہا ”میرا خاوند۔۔۔ وہ اب اتنا بدل چکا ہے۔ وہ اب بھی

میرے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے اور وہ لڑکوں کے لیے ایک اچھا باپ بھی ہے اور ہر شے معمول کے مطابق چل رہی ہے لیکن اس کے باوجود کہیں کچھ ہے جو درست نہیں ہے اور جسے میں صرف محسوس کر سکتی ہوں لنگ۔۔۔۔۔ میرا خاوند اندر سے، دل سے وہ نہیں جو پہلے تھا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے کچھ پھپھار رہا ہے لیکن میں اس کے بارے میں اس کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکتی کیوں کہ وہ موضوع بدل دیتا ہے اور جب میں زور دے کر پوچھتی ہوں تو وہ ناراض ہونے لگتا ہے۔ پتا نہیں میں نے اُس ناگن کو کیوں اپنے گھر میں رکھا جس نے میرے گھر کو مصیبتوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔“

آزین جب اگلی مرتبہ بی لنگ سے ملی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”میرا خیال ہے میرے خاوند نے اُسے داشتہ بنا لیا ہے۔“ اُس نے افسوس اور تلخی کے طے چلے جذبات سے کہا۔ ”میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی۔“ وہ کہتی گئی۔ ”وہ بہت بدل چکا ہے اور اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا ہے اور اُس کے پاس ہر وقت بہت مناسب بہانے ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے میں نے اُسے کلینک میں فون کیا تو کسی نے بتایا کہ وہ گھر جا چکا ہے۔ وہ پورے دو گھنٹے کے بعد گھر آیا۔ جب میں نے دریافت کیا تو کہنے لگا کہ اگلے ماہ نیلا میں ہونے والی کانفرنس کے لیے کچھ چیزیں خریدنے کے لیے کسی دکان میں رک گیا تھا۔ اور میں دیکھ رہی تھی کہ اس کے ہاتھوں میں کچھ بھی نہیں! اب تو میں سوچتی ہوں کہ یہ کانفرنس بھی چند روز کے لیے یہاں سے چلے جانے کا ایک بہانہ ہے۔“

”کیا فضول بک رہی ہو۔ تم جانتی ہو یہ سالانہ میڈیکل کانفرنس ہے اور میرا خاوند بھی

جا رہا ہے۔“ بی لنگ بولی۔

”اور پچھلی جمعرات کو، لنگ۔۔۔۔۔“ آزین کہہ رہی تھی۔ ”تقریباً نو بجے فون کی گھنٹی بجی اور جب میں نے چونکا اٹھا یا اور ہیلو کہا تو فون یک دم بند ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہی ناگن ہوگی۔ اس کا خیال ہوگا اس وقت صرف یون گھر پر ہوگا کیوں کہ جمعرات کو میں ماہ جو لنگ کھیلنے جاتی ہوں اور وہ اس بات سے آگاہ ہے۔ اور کل تو میں نے خود اُسے دیکھا تھا۔ لنگ وہ میٹرو بلڈنگ کے خود کارزینے پر تھی، خوب بنی ٹھنی ہوئی بالکل کسی امیر داشتہ کی طرح۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ لنگ تم بتاؤ کیا سچ مچ میرے خاوند کے اُس کے ساتھ تعلقات ہیں؟“ اور پھر آزین پھوٹ پڑی اور رونے لگی۔





[www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

[www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

[www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

[www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)